ہفت روزہ

ذوالفقار

گھوٹکی

۲۲ ستمبر ۸۷ء

قیمت ۵ روپے

بے نظیر نے ثابت کردیا کہ.....

اقتدار آنی جانی شے ہے

جماعت اسلامی جو اقتدار حاصل کرنے سے پہلے آزادیٔ صحافت کی چیمپئن ہونے کا دعویٰ کرتے نہ تھکتی تھی۔ اب اقتدار کی چمک کے آگے اپنے سابقہ دعوے اور مطالبے کو اس طرح فراموش کرگئی جیسے نظامِ مصطفےٰؐ کے نفاذ اور قیمتوں کو ۱۹۷۰ء کی سطح پر لے آنے کا دعویٰ اگر جماعت اسلامی والوں کے دل میں آزادی صحافت کے لئے ذرا بھی جگہ ہوتی تو وہ اور وہ قلم کی عظمت کا پاس رکھتی تو فاروقی صاحب اپنے عہدے کا چارج سنبھالتے ہی جیلوں کو اسیرانِ صحافت سے خالی کر دینے کا حکم نافذ کرتے اور فرعون مزاج رحمٰن گل اور اس کے ساتھیوں کو برطرف کرکے جعلی لیڈروں سے مذاکرات کرنے کی بجائے برنا، راقب اور نثار سے ملاقات کرکے محاذ آرائی کی جان لیوا فضا ختم کرتے آزادیٔ صحافت کے علمبرداروں کی صف میں اپنا نام لکھوا کر ہمیشہ کے لئے امر ہوجاتے مگر جو جماعت نظامِ مصطفےٰؐ کے دعوے سے غداری کی مرتکب ہوچکی ہو تو وہ آزادیٔ صحافت کو کس شمار میں لے گی۔ فاروقی جی! یاد رکھیئے، اقتدار کی کرسی آنی جانی شے ہے۔

مولانا مفتی محمود نے فرمایا ہے کہ نام نہاد سول حکومت الیکشن کے دوران مستعفی نہیں ہو گی بلکہ خود اپنی نگرانی میں الیکشن کرائے گی۔ کل ہی کی بات ہے جب بھٹو صاحب برسرِ اقتدار تھے تو یہی مولانا موصوف اپنی ٹیم کے ہمراہ یہ مطالبہ کرتے نہ تھکتے کہ الیکشن سے قبل بھٹو صاحب استعفیٰ دے دیں۔ آگے چل کر موصوف فرماتے ہیں کہ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ الیکشن سے قبل کسی نے استعفیٰ پیش کیا ہو۔ مولانا! عوام آپ سے پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ اگر کہیں ایسا نہیں کیا گیا تو آپ نے یہ غیر جمہوری غیر آئینی مطالبہ کرکے کیوں دنیا کو جگ ہنسائی کا موقع فراہم کیا؟۔ اگر اس وقت آپ کو بھٹو صاحب پر اعتماد نہیں تھا کہ وہ دیانت داری سے الیکشن کرائیں گے تو آج ہم کو بھی آپ پر اعتماد نہیں۔

رشیدہ ابراہیم گھانچی
گرین ٹاؤن۔ کراچی

وزراء اپنے اثاثے ظاہر کریں

چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی سرپرستی میں بنائی جانے والی حکومت اپنے آپ کو نمائندہ حکومت یا سول حکومت کہلانے کی حقدار نہیں ہے۔ آج یہ ثابت ہوگیا ہے کہ قومی اتحاد۔ اسلام کی بجائے اسلام آباد چاہتا تھا اور نظام مصطفےٰؐ کا نعرہ محض سیدھے سادے مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لئے لگایا گیا تھا۔ برسرِ اقتدار آنے کے بعد اب وزراء کو نظام مصطفےٰؐ کیوں بھول گیا ہے؟۔ اب فوری نظام مصطفےٰؐ نافذ کیوں نہیں کیا جا رہا۔ قومی اتحاد نے وعدہ کیا تھا کہ اقتدار میں آنے کے بعد ۱۹۷۰ء کی قیمتیں واپس لائیں گے۔ مگر برسرِ اقتدار آنے کے بعد ۱۹۸۰ء کی قیمتیں لے آئے ہیں۔

انقلابی محاذ نے ہمیشہ آزادیٔ صحافت کے لئے جدوجہد کی ہے اور اس وقت تک جدوجہد کرتا رہے گا۔ جب تک صحافت آزاد نہیں ہوجاتی قومی اتحاد اپنے آزادیٔ اظہار کے دعوے سے بھی منحرف ہوگیا ہے اور آزادیٔ صحافت کی دھجیاں اُڑائی جا رہی ہیں۔ صحافیوں کے آٹھ نکاتی مطالبات فوری تسلیم کئے جائیں۔ مکمل سیاسی آزادی بحال کی جائیں، اور تمام نظربند سیاسی رہنماؤں، صحافیوں، مزدوروں، کسانوں، اور طلبہ کو فوری اور غیر مشروط رہا کیا جائے۔ عام انتخابات اِسی سال کروانے کا اعلان کیا جائے۔ اور تمام وزراء فی الفور اپنے اثاثوں کا اعلان کریں۔ تاکہ آئندہ آنے والی عوام کی منتخب حکومت کو دشواریاں کا سامنا نہ کرنا پڑے اور موجودہ وزیر بدعنوانیاں نہ کرسکیں۔

لال حسین راشد
پراپیگنڈہ سیکریٹری
پاکستان انقلابی محاذ (پاکستان)
فیصل آباد

بلتستان کو آزاد کشمیر میں شامل نہ کیا جائے

"بلتستان اور گلگت" اُن دس لاکھ حوصلہ مند بہادر اور غیور عوام کی سرزمین ہے، جنہوں نے قیامِ پاکستان کے ایک سال بعد بغیر کسی بیرونی امداد کے ڈوگرہ شاہی کے خلاف جنگ کی اور سینڈوؤں کے استبداد سے ان علاقوں کو نجات دلاکر جذبۂ اسلامی اور پاکستان دوستی کے جذبے سے سرشار ہوکر وفاقِ پاکستان کے ساتھ رضاکارانہ طور پر الحاق کا اعلان کیا۔ ان دنوں یہ افسوسناک خبر آرہی ہے کہ بلتستان اور شمالی علاقہ جات کو آزاد کشمیر میں ضم کیا جا رہا ہے۔ اس خبر سے یہاں کے عوام میں شدید بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ ملک کے چند مفاد پرست اور نام نہاد سیاستدان اپنی لیڈری چمکانے کے لئے ان علاقوں کو آزاد کشمیر میں شامل کرنے کا بار بار مطالبہ کرتے ہیں۔

بلتستان اور شمالی علاقے جغرافیائی، ثقافتی اور لسانی اعتبار سے آزاد کشمیر سے الگ ہیں۔ آج سے ۳۲ سال پہلے بھی یہ علاقے کبھی بھی کشمیر کا حصہ نہیں رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ یہ علاقے آزاد کشمیر میں شامل کرلئے گئے تو یہ وہاں کے عوام کو ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ سابق عوامی حکومت نے ان علاقوں کی ترقی پر خاص توجہ دی تھی۔

ایف سی آر جیسے کالے قانون کو ختم کر دیا۔ متعدد ترقیاتی منصوبے مکمل کرلئے اور کچھ زیرِ تکمیل تھے۔ تعلیم پر خصوصی توجہ دی۔ طلباء کے لئے سالانہ وظیفے مقرر کئے۔ جاگیردارانہ نظام کو یکسر ختم کر دیا۔ ان علاقوں کو دو ڈسٹرکٹ سے بڑھا کر پانچ ڈسٹرکٹ بنا دیئے گئے۔ لیکن آج ان علاقوں کو رفتہ رفتہ ان سارے حقوق سے بھی محروم کر رہے ہیں۔ جو سابق حکومت نے دی تھیں۔ دو ڈسٹرکٹ گھانچے اور غذر کو ختم کرکے تین ڈسٹرکٹ میں محدود کیا گیا ہے۔ جس سے وہاں کے سینکڑوں غریب ملازمین کے بیروزگار ہونے کا اندیشہ ہے۔ جن کا ذریعہ معاش صرف سرکاری ملازمت ہے۔ تعلیمی اداروں کی حالت دن بدن ابتر ہو رہی ہے۔ طلبہ کے مقررہ وظائف کو محدود کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس طرح ان علاقوں کو سات سال پیچھے دھکیل دینے کی سازش کی جا رہی ہے۔

ہم متعلقہ حکام سے مطالبہ کرنا چاہتے ہیں کہ بلتستان اور شمالی علاقہ جات کو آزاد کشمیر میں شامل نہ کریں، بلکہ وہاں کے عوام کو بھی ملک میں آئندہ ہونے والے عام انتخابات میں رائے دہی کا حق دیں اور قومی اسمبلی میں نمائندگی دیں۔ ڈسٹرکٹ گھانچے اور غذر کا دوبارہ تعین کیا جائے۔ طلبہ کے مقررہ سالانہ وظائف برقرار رکھے جائیں۔ اور ان میں اضافہ کیا جائے۔ ملک کے دیگر شہروں کے تعلیمی/فنی اداروں میں ان کے لئے انجینئرنگ اور میڈیکل کے سیٹوں کی مقررہ کوٹہ میں اضافہ کیا جائے۔ ان علاقوں میں شدید گرانی کا خاتمہ کیا جائے۔

وزیر محمد حسین
(سکریٹری جنرل)
بلتستان یوتھ موومنٹ سنٹرل
کراچی

ہاریوں کی حق تلفی

ون یونٹ کے دور سے لے کر آج تک سندھ کی کئی لاکھ ایکڑ زمین نوکرشاہی کے کارندوں اور ریٹائرڈ فوجیوں کو انعام و نیلام میں دی گئی ہے اور اب تربیلا کے متاثرین کو بھی سندھ کے ضلع ٹھٹھہ میں زمین دینے کا پروگرام بنایا گیا ہے۔

سندھ کے عوام اور دوسرے صوبوں کے حقیقت پسند عناصر یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر سندھ کی زمین سندھ میں صدیوں سے آباد بے زمین ہاریوں میں تقسیم کیوں نہیں کی جاتی؟ آخر سندھ کی زمین پر سندھی ہاریوں کا حق کیوں نہیں تسلیم کیا جاتا؟۔ حد تو یہ ہے کہ جب ان ریٹائرڈ لوگوں کو زمین دی جاتی ہے تو یہ لوگ اس زمین کو آباد کرنے کے لئے کسان (ہاری) بھی دوسرے صوبے سے لاتے ہیں۔ یعنی سندھ کی سرزمین پر کھیتی باڑی کا حق بھی سندھی ہاری کو نہیں دیا جاتا۔

ہم یہ واضح کردیں کہ ہمیں دوسرے صوبوں کے ہاریوں سے کوئی بغض نہیں ہے لیکن جن لاکھوں ہاریوں کو خاص منصوبے کے تحت نوکرشاہی نے سندھ میں آباد کیا ہے۔ ان کو خود رضاکارانہ طور پر حقیقت پسند بننا چاہیئے اور نوکرشاہی کے ہاتھ میں کھلونا نہیں بننا چاہیئے ان کو واپس اپنے صوبے میں جانا چاہیئے۔ اور حکومت کو سے مطالبہ کرنا چاہیئے کہ ان کو اپنے آبائی صوبے میں زمین دے کر آباد کیا جائے۔ ہم ان کے اس حق کی حمایت کریں گے۔ ہمیں افسوس اس بات کا ہے کہ جب بھی کسی ہاری رہنما یا شہری حلقے نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ سندھ کی انعام و نیلام میں دی ہوئی زمین واپس لے کر مقامی بے زمین سندھی ہاری میں تقسیم کی جائے تو نوکرشاہی اور جاگیرداری کے دلالوں نے فتویٰ بازی سے اسے کمیونسٹ، بھارتی اور روسی ایجنٹ کے نام سے نوازا ہے۔ حال ہی میں سندھ کے نوجوان ہاری رہنما ماندھل شر نے جب یہ مطالبہ کیا تو اس کو گرفتار کیا گیا۔ اس پر مسلسل تشدد کیا گیا اور اب باقاعدہ "بھارتی جاسوس" قرار دے کر اس کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ ہم ترقی پسند رہنماؤں، حق پرستوں عالموں اور جمہوریت پسندوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس ظلم کے خلاف آواز بلند کریں۔

مٹھل جمالی
سندھ ہاری کمیٹی۔ حیدرآباد

جاہلوں کا اقتدار

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادیٔ صحافت کا دعویٰ کرنے والوں نے صحافت کو جس قدر پامال کیا اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ آج صحافیوں پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں مستعد صحافیوں کو جیلوں میں ٹھونسا جا رہا ہے۔ پُرامن تحریک چلانے اور اپنے جائز مطالبات کو جائز طریقے سے منوانے کا سب ہی دروازہ بند ہونے پر بھی صحافی برادری نہایت شرافت اور پُرامن طریقے سے اپنی جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔ لیکن درندہ صفت نوکرشاہی ان بے گناہوں پر ظلم کے آسمان ڈھائے ہوئے ہے۔ خدا حق والوں کے ساتھ ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی کوئی یزید کا جانشین آیا۔ حسین کے ماننے والے اس کے سامنے سینہ سپر ہوگئے۔ فتح آخر حق کی ہوگی۔ جناب منہاج برنا اور محمود شام کی قلم کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں

سید اعجاز علی شاہ ۹ ڈرگ کالونی۔ کراچی

ہفت روزہ

ذوالفقار

گھوٹکی

جلد: ۱۵ شمارہ: ۶۶۷

۲۲ ستمبر ۷۸ء

قیمت: ۵ روپے

دفترِ رابطہ

مطبوعات

۶۹ - ڈی نرسری کمرشل ایریا، پی ای سی ایچ ایس، کراچی — ۲۹

فون: ۴۳۲۲۷۴

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

قائم مقام ایڈیٹر
واحد بشیر

کالم نگار
حسین نقی

وقائع نویس
تشبیہہ الحسن

انتظامی امور
حاجی عدیل

سرورق
سعید الدین حسین

خاص مضامین

اسلام آباد
ذوالفقار حیدری

چیف ایڈیٹر
سید اظہر گیلانی

غیر ممالک

بیجنگ
رشید بٹ

ماسکو
محمد زاہد

کینیڈا
سعید ابن سعود

لندن
عبدالحفیظ قریشی

یورپ فاروق طارق

متحدہ عرب امارات مقیم دوبئی
غلام جیلانی

ضلعی نمائندے

تھرپارکر
محبوب احمد

خیرپور، سکھر
جیکب آباد، لاڑکانہ
کامران ابڑو

سانگھڑ
ایاز سندھی

ٹنڈو الہ یار
کامل سمون

ملتان
ناصر زیدی

فیصل آباد
طارق سعید

گوجرانوالہ
محمد افضل جنجوعہ

ٹوبہ ٹیک سنگھ
غیاث الدین جانباز

سرگودھا
الطاف چغتائی

دھاڑی
احسان ملک

گوادر
سلیمان شریف

میانوالی
روشن ملک

آزاد کشمیر
سید نذیر گیلانی

صوبائی نمائندے

سندھ مقیم حیدرآباد
احسان عظیم

پنجاب مقیم لاہور
کاشف

سرحد مقیم پشاور
امان تاجک

بلوچستان مقیم کوئٹہ
ناصر عرفات

اے، اے گیلانی
پبلشر، پرنٹر نے سید پریس
گھوٹکی سے چھپوا کر
دفتر ہفت روزہ ذوالفقار
گھوٹکی سے شائع کیا

آئین کا آخری ستون ڈھے گیا

وادیٔ نیل اور ارضِ مصر پر فرعونوں کے چوبیس خانوادوں نے حکمرانی کی ۔ ہر خانوادے میں کئی کئی پشتیں تھیں ۔ ان میں وہ فرعون بھی شامل تھا جو بنی اسرائیل کے چند ماہر کاریگر اور صناع قبیلوں کو غلام بنا کر لے گیا تھا ۔ اور جو دریائے نیل میں غرق ہوا ۔ ہمیں اس قدیم روش کا تو پتہ ہے کہ میدانِ جنگ میں بادشاہِ وقت بہ یک وقت سربراہِ مملکت اور لشکر کا کمانڈر ہوا کرتا تھا ۔ حالتِ امن میں بھی یہی صورت ہوتی تھی یہ ثابت کرنا راج گرو مودودی اور ان کے چیلوں کا کام ہے ۔ اس سے بہتوں کا بھلا ہوتے کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹی وی سے چیک بھی وصول ہو سکتے ہیں ۔ بہرحال ان فراعین میں سے کئی ایک کی لاشیں حنوط شدہ شکل میں آج بھی محفوظ ہیں اور عجائبات میں شمار ہوتی ہیں ۔ اب اگر کوئی یہ کہے کہ ارضِ مصر کے حکمران موجود ہیں تو آپ کیا کہیں گے؟ کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہمارے اپنے ملک میں بھی ہے ، ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت جو ریاستی ڈھانچہ مرتب ہوا تھا ۔ اس کے ستون ، قومی اور صوبائی اسمبلیاں ، سینٹ ، پارلیمنٹ اور منتخب نمائندہ حکومت تو پہلے ہی ٹوٹ چکے تھے اب آخری ستون منتخب صدرِ مملکت بھی ڈھے گیا ۔ کیا اب بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۳ء کا آئین برقرار ہے ؟ کیا اس کی معطل شدہ صورت فراعین کی حنوط شدہ لاشوں سے کچھ مختلف ہے ؟

۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت فی الحال پہلے اور آخری صدر جناب فضل الٰہی کی سبکدوشی کے بارے میں دو متضاد وجوہات بیان کی جا رہی ہیں ۔ جناب فضل الٰہی کہتے ہیں کہ انہوں نے اصولی اختلافات اور مستقبل قریب میں انتخابات کا امکان نہ ہونے کی بنا پر استعفیٰ دیا ہے ۔ جب کہ جنرل ضیاء الحق نے غیر ملکی ذرائع ابلاغ کو یہ وجہ بتائی ہے کہ جناب فضل الٰہی کی صحت کی خرابی اس سبکدوشی کا سبب ہے ۔ ہمیں جناب فضلِ الٰہی کی بات اس لئے زیادہ قابلِ اعتبار معلوم ہوتی ہے کہ ان کے قول و فعل میں تضاد نہیں پایا جاتا جب کہ دوسری طرف ۵ / جولائی ۱۹۷۷ء سے لے کر اب تک وعدوں سے انحراف کا ایک طویل سلسلہ ہے ۔

منتخب صدر کی سبکدوشی اور نئے صدر کے تقرر کی آئینی حیثیت کے بارے میں تو اہلِ قانون و عدالت فیصلہ کرتے رہیں گے ۔ سیاسی اور قومی نکتۂ نظر سے موجودہ صورتِ حال سے قومی وقار مزید مجروح ہوا ہے ۔

میں جداگانہ انتخاب کے بارے میں آئینی ترمیم کی منظوری نہیں دے سکتا

لاہور جیل کے عین سامنے والے ذاتی مکان میں رہوں گا

سابق صدر مملکت جناب فضل الٰہی چوہدری سے ذوالفقار کا خصوصی انٹرویو

سابق صدر مملکت جناب فضل الٰہی چوہدری کے ایک نہیں تین بار مستعفی ہونے کی خبریں شائع ہونے لگیں تو فوجی حکومت نے ایوان صدر کے ایک ترجمان کے حوالے سے ایک بیان جاری کیا کہ "ایسی کوئی بات نہیں" جناب چوہدری آئین کے تحت نئے صدر کے انتخاب تک اپنے فرائض انجام دیتے رہیں گے، وضاحتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ چوہدری صاحب نے آف دی ریکارڈ اخبار نویسوں کو اپنے خیالات سے نواز دیا۔ پرانے اور منجھے ہوئے سیاست دان کی حیثیت سے انہیں یہ احساس تھا کہ جوابات اخباروں میں نہیں چھپے گی حکومت کے ریکارڈ میں ضرور شامل ہو جائے گی۔ ایسا ہی ہوا اور اچانک ریڈیو پاکستان نے اعلان کیا کہ ۱۶ ستمبر کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ملک کے نئے صدر کا حلف لیں گے۔

سرکاری اعلامیہ کہیے یا نئے صدر کا فرمان کہ یہ سب کچھ چوہدری صاحب کی خرابیٔ صحت کا نتیجہ ہے کہ انہیں یہ بار گراں بھی اپنے کندھوں پر اٹھانا پڑا ویسے یہ سوئے اتفاق ہے کہ ملک کی سیاسی ابتری نے انہیں فوجی مداخلت پر مجبور کیا تھا، ورنہ نجانے کیا ہونے والا تھا اور اب بھی مجبوری ہی اس منصب پر پہنچانے کا موجب بنی ہے۔

حقیقت کیا ہے، مجبوریاں کیا ہیں۔

ان سوالات کا جہاں تک جناب فضل الٰہی چوہدری کے استعفیٰ سے تعلق ہے تو اس کا جواب وہ نہیں جو فوجی حکومت یا نئے فوجی صدر مملکت بتاتے ہیں بلکہ جب میں نے ان سے رابطہ قائم کیا تو محسوس ہوا کہ چوہدری صاحب کو مارشل لاء حکومت میں نظر آنے والی خرابیاں اس قدر ہیں کہ وہ زیادہ دیر تک یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور تاریخ میں یقیناً ان لوگوں کی صف میں شامل نہیں ہونا چاہتے تھے جن کا نام ....

چوہدری صاحب کی آواز میں وہ چیلنج گونج رہا تھا جس کا عوام سامنا کر رہے ہیں کہ میں یہ واشگاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ قانونی معاملات میں ان کی مارشل لاء

باقی صفحہ ۴۷ پر

میں نے مارشل لاء حکومت سے اختلافات کی بنیاد پر استعفیٰ دیا

اقتدار کے بھوکے دھرتی کو خون سے سیراب کرنا چاہتے ہیں

آپ کو صدارتی محل اور گورنر ہاؤس میں جانے کا کوئی حق نہیں

حسین نقی

پاکستان کو بچانے کے لئے آگے آؤ، ماؤں، بہنوں اور بچوں کے لئے اپنا فرض پورا کرو

بعض دوستوں کا خیال ہے کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ بے مصرف ہے کہ طاقت کے ایوانوں میں کسی کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اس لئے ہم سب بلاوجہ اپنے لئے مشکلات پیدا کر رہے ہیں اور بائیں بازو پر حملہ کو دعوت دے رہے ہیں۔

اس لئے میں یہ وضاحت کر دوں کہ ہم حکمرانوں کیلئے نہیں لکھ رہے، ان کے لئے یہ کام ہمیشہ سلہری، نظامی، خلیل الرحمٰن اور مجید اللہ الطاف قریشی، مجیب شامی اور برخوردار صلاح الدین کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا مشغلہ پرانا ہے کچھ کا نیا۔ ہم پڑھنے والوں سوچنے سمجھنے والوں کے لئے لکھتے ہیں۔ پاکستان کے محب وطن عوام کے لئے لکھتے ہیں جن کی زندگی ہمارے حکمران یکے بعد دیگرے اجیرن بناتے رہے ہیں اور ان کے نام پر حکومت پر قابض رہے ہیں اور آج ہیں اور ہم اس صورت حال کو پاکستان کے وجود کے خلاف سمجھتے ہیں۔

ہم ایک بار ٹوٹتے ہوئے پاکستان کو بچانے کی کوشش کرنا چاہتے رہیں۔ ہم نے اسے ٹوٹنے سے بچانے کا پہلے بھی کوشش کی تھی۔ اس واسطے نہیں کہ ہم نے متروکہ املاک ہتھیائی ہے یا "مال غنیمت" میں حصہ بٹایا۔ ہم پاکستان میں لوٹ کے طرفدار نہیں، عہدوں کی لوٹ کے بھی نہیں۔ اس وقت ہماری کوشش ناکام ہوئی لیکن ہم مایوسی کے دشمن ہیں۔

میں اپنے مخلص دوستوں کی اس بات سے بھی متفق ہوں کہ شاید ہماری کامیابی کا امکان ۵ فیصد بھی نہیں ہے کیوں کہ ہمارے پیٹ بھرے بلکہ ہر شام بدہضمی کا شکار ہونے والوں کو اپنی عافیت اسی میں نظر آتی ہے کہ وہ مل جل کر رہنے کے بجائے۔ بھائی چارے اور آزادانہ رائے کی بنیاد جس میں شدید اختلاف رائے کا بھی احترام کیا جائے، کے بجائے پاکستان کو خون خرابے کی، انتشار اور افراتفری کی نذر کر دیں۔

ہمارے دوستوں کو ۱۹۷۱ء کا خون خرابہ بھی یاد ہے اور ان کا خیال ہے کہ خون کی پیاس بجھی نہیں بلکہ بھڑک رہی ہے۔ ان کی دلیل وزنی ہے کہ اگر اپنے مفادات کے لئے پاکستانی مسلمان پاکستانی مسلمان کا خون بہا چکا ہے۔ مسلمان مسلمان کی آبرو ریزی کر چکا ہے، اور اس پر فخر بھی کر چکا ہے تو دوبارہ یہ سب کچھ کیوں نہیں ہو سکتا۔

میں اس سے منکر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے حکمران طبقے ظلم، تشدد، بربریت میں کسی سے کم نہیں۔ لیکن میں ایک اور بات بھی کہنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ اگر ہمارے محب وطن عوام دوست، دانشور، محنت کش، سیاسی کارکن، صحافی طالب علم اخلاقی اور ایمانی جرأت کا مظاہرہ کریں اور اپنی اور آئندہ نسلوں کی مشکلات کا اندازہ کرتے ہوئے برملا اپنی رائے کا اظہار کریں تو ظلم کے ہاتھ روکے جا سکتے ہیں۔ فیئر پلے کیلئے قائل کیا جا سکتا ہے، قائل نہ ہوں تو مجبور کیا جا سکتا ہے۔

مجھے ذاتی طور پر کوئی وجہ نظر نہیں آتی نہ خوف لاحق ہوتا ہے کہ میں جنرل ضیاء الحق، جنرل اقبال خان، جنرل سوار خان، جنرل رحیم الدین خان، جنرل سید شفقت رفاقت سے یہ کہوں کہ آپ کے تمام عہدے پاکستان کے وجود کے مرہونِ منت ہیں، آپ کی تنخواہ، سواری، آپ کے تربیت پر اس ۸۰ فی صد ننگی بھوکی قوم کا فی کس دس، بیس، پچاس لاکھ یا ایک کروڑ روپے اس لئے صرف کئے گئے تھے کہ آپ اس کی جغرافیائی یوں دوبارہ زور دیکر دہراتا ہوں جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کریں۔ آپ کو صدارتی محل اور گورنر ہاؤس میں جانے کا کوئی حق نہیں ہے کہ یہ حق تحریک پاکستان، مفکرِ پاکستان علامہ اقبال، قائداعظم محمد علی جناح نے آپ کے لئے تجویز نہیں کیا تھا۔ کیا ہو تو شہادت لائیے۔ نہیں کیا تھا۔

یہ حق بھی ان حضرات کو نہیں ہے کہ یہ ہماری ساری دفاعی قوت کو مفلوج اور مایوسی کا شکار کر دیں یا اس کا رخ اپنے ہی بھائیوں کی طرف موڑ دیں۔ کسی قانونی، اخلاقی (خدارا اسلام کا نام بیچ میں لا کر اس کی مٹی پلید نہ کریں) سپاہیانہ اصول کے تحت یہ حق ان حضرات کو نہیں ہے کہ وہ ہمارے حاکم بن بیٹھیں۔ نہ ہی یہ حق آئین نے ہمارے اعلیٰ ترین عدلیہ کے چیف جسٹسوں کو دیا ہے کہ وہ تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر حلف اٹھوائیں۔ یہ سراسر پاکستان کے وجود کو خطرہ میں ڈالنے اور پاکستان کو، مسلمانوں کو دنیا بھر میں رسوا کرنے کا راستہ ہے۔ خدارا اس سے پرہیز کیجئے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے لئے جن لوگوں کو سب کچھ لٹانا پڑا (وہ اس زمرے میں شامل نہیں جنہوں نے سود در سود وصول بھی کر لیا) وہ جنہوں نے تحریک پاکستان کی بے لوث قیادت کی (وہ بھی اس زمرے میں شامل نہیں جنہوں نے پاکستان بننے کے بعد لوٹ گھسوٹ کی صورت میں اس کا مسلسل فائدہ اٹھایا) انہوں نے یہ کچھ آزادی، عزت اور وقار کے تحفظ اور ایک بہتر انسانی معاشرے کے قیام کے لئے کیا تھا۔ قائداعظم کی تو محض ہڈیاں اور کھال ہی بچی تھی جب پاکستان وجود میں آیا۔ کچھ تو ان کا، تحریکِ

باقی صفحہ ۲۸ پر

بھارت

شبیر الحسن

سیلاب کی تباہی اور سیاسی طوفان کی لپیٹ میں ہے

پندرہ ہزار افراد کی ہلاکت اور صاحب اقتدار کی عیاشیوں کے اسکینڈل نمایاں واقعات ہیں

بھارت اس وقت دہری مصیبت کا شکار ہے ایک جانب سیلاب نے تباہی مچا رکھی ہے، دوسری جانب سیاسی افق پر طوفانی بادل منڈلا رہے ہیں۔ اونچی ذات سے تعلق رکھنے والے بھارتی وزیر اعظم شری مرار جی ڈیسائی جن کی پیشاب پینے کی شہرت سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے نافذ کردہ ایمرجنسی کے دوران آہنی ہاتھوں کے مظالم سے کسی طرح کم نہیں، امریکی حمایت کے باوجود سخت امتحان میں گھرے ہوئے ہیں۔ ادھر جنتا پارٹی کے ایک اہم ستون چرن سنگھ، ان کے اتحادی راج نرائن نے ان پر کیچڑ مارنے کا سلسلہ جاری کیا ہوا ہے۔ جبکہ کانگریس کی رہنما مسز اندرا گاندھی مزاجی صورتحال سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ کو دوبارہ بحال کرنے اور جنتا حکومت کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے میں تجربہ کار عورت کی دانائی سے کام لینے میں بھارت کی نامور خواتین کو کافی حد تک پیچھے چھوڑ چکی ہیں۔ بھارتی عوام میں غیض و غضب کا جو لاوا امنڈ رہا ہے اس کا ایک مظہر تو پارلیمنٹ سے باہر وزیر خارجہ باجپائی کے زخمی ہونے کی صورت میں سامنے آیا۔ پہلے اس قدرتی آفت کا ذکر ہو جائے جس کا زیادہ تر نشانہ بھارت کے غریب اور مفلوک الحال عوام بن رہے ہیں۔ پچھلے دنوں بھارت کے طول و عرض میں جو سیلاب آیا اس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر تباہی پھیلی۔ سیلاب سے ہلاک ہونے والوں، بے گھر ہونے والوں، املاک اور فصلوں کی تباہی کے اعداد و شمار اندازے سے کہیں زیادہ ہیں۔

صرف دارالحکومت میں کم و بیش دو لاکھ افراد بے گھر ہو گئے۔ جمنا کی بپھری ہوئی لہروں نے جدھر کا رخ کیا، تباہی کے نشانات چھوڑ گئیں۔ دہلی کے خوشحال طبقوں کے علاقے اور مہارانی باغ جو ہمیشہ محفوظ سمجھے جاتے تھے اس بار جمنا کی گرجتی، گونجتی اور جوش مارتی طوفانی لہروں سے محفوظ نہ رہ سکے۔ متاثرہ علاقوں کے لوگوں نے اپنا گھر بار اس خوف سے چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ کہیں ان کی عدم موجودگی میں کوئی ان کے بچے کھچے اثاثوں پر ہاتھ صاف نہ کر دے

جہاں تک غریب طبقات کے لوگوں کا تعلق ہے جن، کے پاس کھونے کے لئے کچھ نہیں ہوتا، تو ان کے انخلاء کا کام فوج سے کرایا گیا۔ غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دہلی میں مرنے والوں کی تعداد ۵۰۰ بتائی گئی ہے۔ جبکہ سرکاری افسروں نے صرف ۵۰ کا ہندسہ ظاہر کیا ہے۔ پرائیویٹ بوٹ آپریٹروں نے متاثرہ خاندان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے لئے ۲۵۰ روپے معاوضہ طلب کیا۔

کانتی

سریش

۵ اور ۶ ستمبر کو آل انڈیا ریڈیو نے اپنے بلیٹن میں دہلی کے باشندوں کو بار بار متنبہ کیا ہے کہ وہ پانی ابال کر پئیں، اترپردیش، مغربی بنگال، ہریانہ، بہار اور اڑیسہ میں

باقی صفحہ ۲۸ پر

بے نظیرؒ نے ثابت کر دیا کہ ......

سرحد میں بے نظیر کے استقبال کی کوئی نظیر نہیں ملتی

امان تاجک

آنسہ بے نظیر بھٹو دورہ سرحد کے آخری مرحلے پر کوہاٹ پہنچ چکی ہیں۔ وہ اب تک ایبٹ آباد، ہری پور، پشاور، مینگورہ، ہانقیاں، نوشہرہ، مردان، بشت نگر (چارسدہ) اور گگے والا میں خطاب کر چکی ہیں۔ گو یہ اجلاس بند جگہوں، احاطوں اور چار دیواری کے اندر ہوتے، لیکن ان میں عوام کی بھاری تعداد نے شرکت کر کے سرحد کی سیاسی صورت حال کو یکسر بدل دیا ہے بلکہ ان بدلے ہوئے حالات کو واضح شکل دے دی ہے۔ سرحد کے عوام جن کے خمیر میں سرکار کی چوکھٹ پر جبیں سائی کا کوئی عنصر شامل نہیں، وہ مختلف شکلوں میں موجودہ حکومت کے خلاف اپنا ردِ عمل ظاہر کر چکے ہیں۔ پہلے پہل سرحد میں عورتوں نے جلسے جلوس نکال کر سرحد میں بدلتی سیاست کی نشاندہی کر دی تھی۔ پھر طلبا نے جو کسی بھی جدوجہد میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں، پورے سرحد میں حکومت اور حکومت کے حامی گروپوں کو عبرت ناک شکست دے کر اپنی رائے کا اظہار کر دیا۔ بائیں بازو کے لوگوں نے انہیں بلایا تو اپنے جسموں پر کوڑے اور قید و بند

کو لبیک کہا۔ اور اب جب بے نظیر نے سرحد کو اپنے پہلے دورے کے لئے چنا تو سرحد نے اسے قطعی مایوس نہیں کیا۔ ہر جگہ ہر مقام پر اتنی بڑی تعداد نے انہیں خوش آمدید کہا کہ خود وہ بھی شاید اس کی توقع نہ کر سکی ہوں۔

اپنے دورے کے پہلے مرحلے پر جب وہ ایبٹ آباد پہنچیں تو اقبال جدون اور ان کے ساتھیوں نے بے نظیر کے سر پر چادر ڈال کر سرحد کی بیٹی کا خطاب دیا، تو دوسری طرف وقت کی جبر و قہر کی طاقتوں کے خلاف ہزارہ کے عوام کا ردِ عمل بھی ظاہر کیا۔ اقبال جدون نے جن کے خلاف اب تک غالباً مارشل لاء کے حکم نمبر ۱۳ کے تحت مقدمہ قائم ہو چکا ہے۔ اس دورے کے ابتدائی مرحلے میں ہی بتا دیا تھا کہ ہزارہ کی مارشل لاء اور سول انتظامیہ انہیں دھمکا چکی ہے کہ اگر انہوں نے بے نظیر کا استقبال کیا، تو وہ اس کی سزا سے نہیں بچ سکیں گے۔ اقبال جدون نے کہا، کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے، کہ جائیداد تو چھوٹی سی چیز ہے اگر جان بھی دینی پڑے تو وہ ایک

قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے، بلکہ چیئرمین بھٹو کی قیادت میں آگے بڑھتے رہیں گے

ہزارہ میں داخل ہوتے ہی بے نظیر کو سرحد کے لوگوں نے وہ مقام عطا کر دیا ہے، جس کی مثال سیاست کی تاریخ میں کسی زیرِ عتاب کو نہیں ملی۔ ہزاروں غریب کسان، مزدور اور طلباء نے جس جوش و خروش کا مظاہرہ کیا اس کی نظیر بے نظیر سے قبل موجود نہ تھی۔ ہزارہ سے آگے بڑھیں تو پشاور کے لوگوں نے اپنے دل فرشِ راہ کر دیئے

جرأت اور حوصلوں کے سمندر میں بندوقیں تنکوں لگتی تھیں

یہ ۱۱ ستمبر کا دن ہے۔

آج شہر میں پولیس کی ہلچل کچھ زیادہ ہی ہے گاڑیاں، جس میں ہیلمٹ پہنے اور بندوقیں تانے پولیس والے بیٹھے ہیں، دندناتی پھر رہی ہیں، لمبے لمبے ڈنڈوں والے یہ جیالے جانباز بھوکے شیروں کی طرح جی ٹی روڈ پر گھوم رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں عجیب عجیب ڈوریاں ناچ رہی ہیں۔ بڑے آفیسروں کی کاریں میٹروسینما سے سکریٹریٹ کی عمارت تک چکر کاٹ رہی ہیں، عجیب خوف کی فضا ان کے چہروں سے شہر کے بدن تک پھیل رہی ہے لیکن پشاور شہر کے جی دار لوگ ان ساری باتوں سے بے نیاز خراماں خراماں سکیرہ رام کے احاطے کی طرف بڑھ رہے ہیں، ان کے چہروں پر خوف و ہراس کی کوئی لکیر نہیں۔ ان کی آنکھوں میں جرأت اور حوصلے کا ایک سمندر موجزن ہے۔ ان میں بے شمار ایسے ہیں، جو قید اور کوڑوں کے عذاب سے گزر چکے ہیں، بیشتر ایسے ہیں جن کے پیاروں کے بدن پر کوڑوں کے نشانات نے انہیں خوف کے آشوب سے نکال کر بے پناہ جرأتیں بخش دی ہیں اور شاید اس لئے پولیس کی بے پناہ بندوقوں، ڈنڈوں اور رائفلوں کے دہانوں کے سامنے سے ہوتے ہوئے یہ لوگ سکیرہ رام پہنچ رہے تھے، جہاں کچھ ہی دیر بعد ان ہی کی طرح جرأت مند آنسہ بے نظیر بھٹو کو خطاب کرتے آنا تھا۔

سکیرہ رام کا احاطہ بھر چکا ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ پھیل رہے ہیں، گلیاں بھرتی جاتی ہیں۔ باہر سروس روڈ انسانوں کے سروں کا دریا بن جاتا ہے اور پھر بے چین لوگ باہر جی ٹی روڈ تک پھیل جاتے ہیں کسی اعلان کے بغیر آنے والوں کی تعداد بیس ہزار سے بڑھنے لگتی ہے۔ ہر طرف ایک ہی شور ہے، ایک ہی نعرہ ہے۔

بھٹو آباد — اس کے دشمن برباد۔

بے نظیر آتی ہے۔ نعروں کی آواز سے خلا اور پھر سکریٹریٹ میں بیٹھے ہوئے مقامی آقاؤں کی کرسیوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ ایک لہر اٹھتی ہے۔ بے نظیر اسے بھٹو لہر کہتی ہے۔ بے نظیر موجودہ حکومت کو تنبیہہ کرتی ہے کہ لوگ تم سے بیزار ہیں۔ تمہارا تشدد بھی انہیں تمہارا ہمنوا نہیں بنا سکتا۔ اب تمہارے لئے ایک ہی راستہ ہے۔ انتخابات — تمہاری اور ملک دونوں کی بقا انتخابات میں ہے۔ اور عوام — واپس جاؤ — انتخابات کراؤ۔ کے نعروں سے تشدد کے سینے میں شگاف ڈالنے لگتے ہیں۔ بے نظیر کی آواز نوے فیصد لوگوں تک نہیں پہنچ رہی، لیکن سب ہمہ تن گوش ہیں۔ حویلی کے اندر سے نعرے کی آواز آتی ہے، تو باہر والے بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں

بے نظیر تقریر ختم کرتی ہے۔ عوام کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر سڑک پر آ گیا ہے۔ جی ٹی ایس سے چونگی تک پُرجوش انسانوں کا یہ جلوس بغیر کسی پروگرام کے نعرے بلند کرتا آگے بڑھنے لگتا ہے۔ جلوس میں پیپلز پارٹی کا کوئی جانا پہچانا کارکن شامل نہیں نہ ہی کوئی رہنما موجود ہے، لیکن عوام خود ہی آج جلوس کی قیادت کر رہے تھے، نئے نئے نعرے لگ رہے تھے۔

خدا جھوٹوں سے خوش نہیں ہوتا۔ وعدہ پورا کرو

۹۰ دن کو ۹۰ سال میں مت بدلو۔

فوج سیاست سے واپس جائے،

جماعتِ اسلامی کی حکومت نامنظور، نامنظور،

نامزد حکومت ختم کرو۔

ایک ہی نعرہ ایک ہی بات۔ انتخاب، انتخاب

بھٹو کو رہا کرو۔

یہ جلوس نعرے لگاتا ہوا سیکار نو چوک پہنچا۔ جہاں نعروں میں شدت آ گئی۔ کچھ دیر نعرے بلند ہوتے رہے اور پھر عوام ازخود منتشر ہو گئے۔

اور جب اس جلوس کے شرکاء اپنے گھروں میں پہنچے، تو پولیس اپنے اصل کارنامے سرانجام دینے سڑکوں پر آ گئی۔ رات کے اندھیروں میں کارکنوں کے گھروں پر چھاپے پڑنے لگے۔ چادر اور چاردیواری کے ٹھیکیداروں کے دور میں چادر اور چاردیواری

باقی - نمبر ۴۶ پر

جائداد کیا جان حاضر ہے، سیاست کا نقشہ بدل چکا ہے

لیجئے آئین کا بالکل ہی بولو رام ہو گیا

مجبوری نے صدارت کی کرسی تک پہنچا دیا ہے

ذوالفقار حیدری

لیجئے پاکستان کے متفقہ آئین کا بالکل ہی بولو رام ہو گیا۔ متفقہ آئین کی ایک رہی سہی علامت صدرِ مملکت چودھری فضل الٰہی نے بھی عام انتخابات کے بارے میں غیر یقینی صورتِ حال، آئین میں مجوزہ ترامیم کے فیصلے اور مارشل لا حکومت کی طرف سے نظریۂ ضرورت کی حدود سے تجاوز پر عدمِ اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے منصبِ صدارت چھوڑ دیا ہے۔ صدر چودھری فضل الٰہی جو آئینی تسلسل کا مظہر تھے، کی منصبِ صدارت سے علیٰحدگی کے بعد اب یہ پردہ بھی ختم ہو گیا ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے اپنے فوجی پیشروؤں کی طرح چوتھی ٹوپی بھی اپنے سر پر سجا لی ہے اگر اس ملک میں کوئی اور عہدہ باقی ہوتا تو وہ بھی ضیاء الحق اپنی جھولی میں ڈال لیتے۔ اب وہ صدرِ مملکت ہیں، وزیر اعظم کے فرائض ادا کرتے ہیں ان دونوں فرائض کو ادا کرنے کا اہل بننے کے لئے انہیں چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بننا پڑا اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر وہ چیف آف آرمی سٹاف کی حیثیت سے ہیں، ہم نے ان کالموں میں مہینوں پہلے لکھا تھا کہ جنرل ضیاء الحق ملک کے صدر کا عہدہ بھی سنبھال لیں گے۔ اس وقت اس خبر کی بڑی پُرزور تردید کی گئی تھی اب وہ چار ماہ تک قائم مقام صدر رہیں گے۔ کیونکہ اس وقت تک قانونی اور آئینی طور پر چودھری فضل الٰہی صدرِ مملکت کی حیثیت سے رخصت پر تصور ہوں گے۔ ضیاء الحق صاحب کہیں گے کہ انہوں نے یہ عہدہ بڑی مجبوری کے عالم میں سنبھالا ہے۔ واقعی وہ مجبور تھے کہ جناب فضل الٰہی چودھری نے اپنے آخری خط میں انہیں لکھا تھا کہ وہ ۱۶ ستمبر کو منصبِ صدارت چھوڑ دیں گے اور ایوانِ صدر خالی کر دیں گے اگر اس خط کا بھی پہلے خطوط کی طرح جواب نہ دیا جاتا تو بڑی سُبکی ہوتی کہ صدرِ مملکت ایوانِ صدر ہی چھوڑ کر چلا جاتے۔ ظاہر ہے کہ جنرل ضیاء الحق کی ہی یہ ذمہ داری تھی اور ہے کہ وہ عہدے کو جو خالی ہو اپنی جھولی میں ڈالتے چلے جائیں۔ اس سے پہلے ایوب خان اور یحییٰ خان نے بھی یہی کیا تھا۔ ایوب خان سے ہمارے ممدوح یوں ہی متاثر نہیں ہیں، ایوب خان کے دور کو وہ پاکستان کی تاریخ کا سنہرا دور قرار دیتے ہیں۔ اس سنہری دَور تک پاکستان کو واپس لے جانے اور وقت کے دھارے کو الٹا چلانے کے لئے نجانے انہیں اب کیا کیا پاپڑ بیلنا پڑیں گے ان کے عزائم کی تکمیل صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ کابینہ میں مسلم لیگی اور جماعت اسلامی کے ذہن کے افراد ہی شامل ہوں۔ ان دونوں جماعتوں کو آمریت بڑی راس ہے۔ یہ ہر اُس دَور میں خوب پھلتی پھولتی ہیں جب پابندیاں ہوں کہ ان کا عوام سے کوئی براہِ راست رابطہ نہیں ہے۔ ویسے بھی یہ عوام کے قائل نہیں ہیں۔ اب بھی جنرل ضیاء الحق صاحب کو منصبِ صدارت سنبھالنے کا مشورہ جماعتیے اور مسلم لیگی وزراء نے ہی دیا ہے صدرِ مملکت فضل الٰہی چودھری کا آخری خط بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹنے کے مترادف ہے۔ اس خط میں جناب فضل الٰہی چودھری نے مبینہ طور پر لکھا ہے کہ موجودہ غیر یقینی صورتحال میں وہ اپنے فرائض ۱۶ ستمبر کے بعد ادا کرنے سے قاصر ہوں گے۔ صدر فضل الٰہی چودھری نے اس خط میں لکھا کہ میں آپ کے مشورے کے تحت اپنے صدارتی فرائض اس امید پر ادا کرتا رہا کہ آپ سپریم کورٹ کے فیصلے کے مطابق جلد از جلد ملک میں انتخابات کے انعقاد کا انتظام کریں گے لیکن یہ نظر آ رہا ہے کہ مستقبل قریب میں انتخابات نہیں ہو سکیں گے جس کے بعد میرا منصبِ صدارت پر فائز رہنا بے معنی ہو جاتا ہے۔

صدر فضل الٰہی چودھری اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق نے ۲۸ اگست کو آخری ملاقات کی تھی۔ اس میں انہوں نے واضح کر دیا تھا کہ اگر چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر انتخابات کی قطعی تاریخ کا اعلان کر دیں تو اس صورت میں وہ اپنے فرائض کی مزید انجام دہی پر رضامند ہو سکتے ہیں۔

صدر فضل الٰہی کی فرائض سے سبکدوشی کا یہ غیر متوقع اعلان ایک بہت بڑے آئینی بحران کی نمائندگی کرتا ہے۔ صدرِ مملکت کا خالی عہدہ سنبھالنے کے لئے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو ایک آرڈیننس کے ذریعے نامزد کیا گیا تھا اب اس آرڈیننس کی منسوخی کے بغیر ہی جنرل ضیاء الحق صاحب نے اپنی نامزدگی کرا لی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب ان کی نظر میں آئین کی کیا اہمیت ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اب آئین کی منسوخی کے باقاعدہ اعلان میں کیا قباحت باقی رہ گئی ہے۔ آئین کی منسوخی کے بعد اس ملک کا جو حشر ہو گا خدا ہمیں اس کو دیکھنے سے معاف رکھے۔ ۱۹۷۳ء میں جن امور پر اتفاق ہو گیا تھا اب ان پر اتفاق قیامت تک نہیں ہو سکے گا کہ اس اتفاق کے پیچھے مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت تھی اور اب وہ بونے باقی رہ گئے ہیں جن کی باتیں ان کے گھر والے بھی نہیں مانتے ایسے لوگ کسی دوسرے سے کیا منوا سکیں گے۔ یہ علیٰحدہ بات ہے کہ مثبت نتائج کے ذریعے ایسے انگوٹھا چھاپ منتخب کرا لئے جائیں جو شاہ

سے بھی زیادہ وفادار ہوں۔ آئین کے بارے میں ہمیں موجودہ جرنیلوں میں سے ایک بڑے دنیک قسم کے جرنیل کا تبصرہ فوجی جنتا کی حقیقت پسندی کا مظہر لگتا ہے۔ مارشل لا لگتے ہی ان سے سوال کیا گیا کہ آئین کی موجودگی میں مارشل لا کا کیا جواز ہے اور کیا آپ مارشل لا کو مانتے ہیں۔ انہوں نے کسی تردد کے بغیر سوال کرنے والے سے پوچھا۔ آپ مسلمان ہیں' جواب ملا الحمدللہ' جنرل صاحب نے کہا آپ قرآن کریم کو خدا کی آخری کتاب اور آخری شریعت مانتے ہیں، ماننے والوں کے لئے قرآن کریم سے زیادہ مقدس کوئی کتاب نہیں ہے اور نہ ماننے والوں کے لئے اس کی حیثیت ایک سادہ کتاب یا عام ڈکشنری سے بھی کم ہے' ان کا یہ جواب آئین کی آئین کے بارے میں سوچ واضح کرتا ہے۔ آئین ماننے والوں کے لئے آئین اور نہ ماننے والوں کے لئے دس ردی صفحے ہیں جنہیں کبھی بھی پھاڑ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ آئین کی روح کے خلاف مارشل لا لگا، آئین کی روح کے خلاف اسمبلیاں ٹوٹیں، اس توڑ پھوڑ اور آئین سے انحراف کو اس لئے برداشت کیا گیا کہ ۹۰ روز میں انتخابات کرانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ آئین کو منسوخ نہیں کیا گیا تھا بلکہ اعلان کیا گیا تھا کہ اس کی کچھ دفعات معطل ہیں جن کی تا حال وضاحت نہیں ہوتی ہے، آئین کے محافظ کی حیثیت سے صدرِ مملکت کا عہدہ موجود تھا جس پر جناب فضل الٰہی چودھری فائز تھے اب وہ بھی سبکدوش ہو گئے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب کے صدر کا عہدہ سنبھالنے کا اقدام آئین کی روح کے قطعی خلاف اور آئین کی بنیاد کے منافی ہے یہ آئین پارلیمانی نظام حکومت کے لئے بنا تھا مگر اب ملک میں ایک طرح سے صدارتی نظام حکومت ہے' اس تبدیلی کے لئے کسی رسمی اعلان کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی گئی۔ پاکستان قومی اتحاد میں شامل وہ جماعتیں جو پارلیمانی نظام حکومت پر اس حد تک یقین رکھتی ہیں کہ انہوں نے اس کے لئے بے پناہ جدوجہد کی۔ ایوب خان کے خلاف جب عوام نے اپنی تحریک سے فیصلہ دے دیا تھا تو انہوں نے ایوب خان سے یہ بات مذاکرات کی میز پر اس لئے منوالی تھی کہ اس طرح وہ شریکِ اقتدار ہو سکتے تھے اب وہی لوگ وہ نام نہاد جمہوریت پسند صدارتی نظام میں اپنی نوکریاں پکی کرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ اس صورتِ حال کو نوابزادہ نصر اللہ خان اور مفتی محمود اپنی اپنی جماعت کے موقف کی روشنی میں قبول نہیں کریں گے البتہ اقتدار میں شرکت برقرار رکھنے کے لئے وہ نام نہاد پاکستان قومی اتحاد میں اقتدار کے بھوکے ٹولے کے دباؤ سے مجبور ہو کر اس صورتِ حال کو قبول کرنے پر مجبور ہوں گے مگر اصول کسی مجبوری کے تابع نہیں ہوتے۔ مگر اب تو شریکِ اقتدار وہ لوگ ہیں جو اس شعر پر یقین رکھتے ہیں۔

جھکنے والوں نے رفعتیں دیکھیں

دور ہی ایسا ہے کہ جھکنے والے رفعتوں کو چھونے کی کوشش میں مصروف ہیں مگر لعنتوں کے طوق گلے میں ڈال کر اسے پھولوں کے ہار سمجھنے والے جلد ہی اپنی اصلیت اور مقام کو سمجھ لیں گے، دیر ضرور ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔

اندرون سندھ

سیاسی اقربا پروری
نوازشات اور دھونس شروع ہو چکی ہے

قصہ مولانا نورانی کی جنرل سے ملاقات کا

احسان عظیم

گزشتہ ہفتے مولانا نورانی نے حیدرآباد میں ایک پریس کانفرنس کی۔ موجودہ حکومت کی کابینہ کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا۔ نورانی میاں کے مطابق موجودہ کابینہ میں شامل وزیر چور دروازے سے آنے والے غیر نمائندہ ہیں۔ سول کابینہ نام نہاد، غیر جمہوری، غیر اخلاقی ہے۔ ان کے مطابق احتساب کی غیر ضروری طوالت نے عوام کے اعتماد کو بہت زیادہ مجروح کیا ہے اور اب غیر نمائندہ، غیر جمہوری، نام نہاد کابینہ کی موجودگی میں احتساب انتقام ہو کر رہ جائے گا۔ حکومت میں شامل محاذ کی جماعتوں نے اپنے منشور کے مطابق نہ تو نیشنل پریس ٹرسٹ توڑا ہے اور نہ پریس اینڈ پبلی کیشن آرڈیننس منسوخ کیا ہے۔ مولانا نے ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ قومی اتحاد ایک سیاسی اتحاد تھا۔

مولانا کی شدید برہمی کی وجوہات میں اور باتوں کے علاوہ ایک وجہ ان کی جنرل ضیا سے حالیہ ملاقات بھی ہے۔ ملاقات کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ جنرل صاحب نے عید کی رات خود فون کر کے مولانا سے ملاقات کی خواہش کی۔ ایران کے دورے کے بعد کراچی میں ملاقات طے پائی۔ ملاقات کا وقت ڈھائی بجے دن مقرر ہوا مولانا صاحب اپنی ٹیم کے ساتھ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس پہنچ گئے مولانا کا خیال تھا کہ دروازے پر ہی ان کی زبردست پذیرائی ہوگی۔ لیکن وہاں انہیں کوئی خاطر میں ہی نہیں لایا۔ پھر کسی معمولی افسر نے انہیں مہمان

خانے میں بٹھایا۔ مہمان خانے میں ان سے پہلے ۱۹۵۶ء کے دستور کے خالق سابق وزیراعظم چودھری محمد علی بھی، تشریف فرما تھے۔ ابھی بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ کوئی بریگیڈیئر صاحب تشریف لائے۔ ظہور الحسن بھوپالی کو ایک طرف کر کے بتایا کہ مولانا نورانی کی ملاقات کا وقت سہ پہر مقرر ہے۔ ڈھائی بجے جنرل صاحب چودھری محمد علی سے ملاقات کرنے والے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کمرہ ملاقات یہی ہے اور چونکہ جنرل صاحب چودھری محمد علی سے ملنے آنے ہی والے ہیں اس لئے مولانا دوسرے کمرے میں چلے جائیں وقت میں تبدیلی، پذیرائی میں ٹھنڈک اور پھر کمرہ بدلنے کی خبر پر چراغ پا ہو گئے۔

ہوتا تو یہ کہ شائد مولانا واپس ہونے کا فیصلہ کرتے لیکن انہوں نے یہ سب کچھ جنرل صاحب کی لاعلمی سمجھا بہرحال ملاقات کا خیال مقدم رہا۔ اور مولانا دوسرے کمرے میں پہنچ گئے۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ دوسرے کمرے میں مولانا کی "برین واشنگ" کے لئے سابق پرڈو کرلیا آفیسر نواب چھتاری صاحب براجمان تھے۔ اب گو کہ ملازم نہیں رہے۔ پھر بھی سننے میں آ رہا ہے کہ شائد سویلین گورنری کے فیصلے کے بعد گورنر قرار پائیں۔ بہرحال چھتاری صاحب نے مولانا کو موجودہ حکومت کی حمایت پر آمادہ کرنے کی بھرپور سعی شروع کردی۔ اسی دوران جنرل صاحب چودھری محمد علی کے کندھے پر ہاتھ رکھے انہیں چھوڑتے باہر نکلے اور مولانا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ مولانا سر وقد کھڑے ہوئے زوردار سلام علیکم کی صدا بلند کی۔ جنرل صاحب سے باتیں، شروع ہوگئیں۔ مولانا کو خیال تھا کہ جنرل صاحب نے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے تو کچھ اہم باتیں کریں گے۔ لیکن جنرل صاحب کی طرف سے رسمی باتیں ہی رہیں۔ وہیں مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر زون سی اور اب گورنر لیفٹیننٹ جنرل عباسی سے جنرل صاحب نے تعارف کرایا مولانا نے ریڈیو اور ٹی وی پر نظر انداز کرنے کی شکایت کی مسجدوں میں درود و سلام پڑھنے پر پابندی کا تذکرہ کیا۔ دوسری طرف جنرل صاحب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ لیکن ان کی شکایات پر کوئی مثبت وعدہ نہیں کیا۔ اس طرح مولانا کی موجودہ حکومت کے بارے میں مایوسی میں کچھ اور بھی اضافہ ہوگیا۔

مارشل لاء کابینہ کی تشکیل کو تقریباً ایک ماہ ہونے والے ہیں۔ لیکن صوبائی کابینہ کی تشکیل کا ابھی دور، دور تک پتہ نہیں ہے۔ قومی اتحاد کے سربراہ مفتی محمود نے پہلے عید کے بعد کی خبر سنائی تھی۔ پھر اسے اکتوبر تک لے گئے۔ دوسری طرف مولانا نورانی صوبائی کابینہ کی تشکیل کو فاش غلطی قرار دے رہے ہیں۔ بلکہ ان کے خلاف شدید ردعمل کی بھی پیشن گوئی کر رہے ہیں۔ صوبائی حکومت تشکیل پائے گی۔ یا نہیں۔ یہ تو رموز مملکت ہیں بڑے ہی جانیں، جہاں تک سندھ کا تعلق ہے۔ وزارت کی بندر بانٹ نے۔ پارٹیوں کے درمیان اور پارٹیوں کے اندر شدید کھینچا تانی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ شکارپور کی سومرو خاندان یعنی حاجی مولا بخش سومرو خانوادے کے رحیم سومرو صاحب بھی صوبائی وزارت کے متمنی ہیں۔ رحیم سومرو صاحب ابھی چند دلوں تک تحریک استقلال میں تھے۔ اور تحریک استقلال چونکہ نامزد حکومت کے حق میں نہیں ہے۔ اس لئے سومرو صاحب کے وزیر بننے کا چانس نہیں تھا۔ اس کا ایک ہی حل تھا کہ وہ تحریک استقلال چھوڑ دیتے۔ چنانچہ انہوں نے تحریک سے وابستگی ختم کردی۔ اب وزیر بننے کے لئے راستہ صاف ہے اب ایسے میں اگر وزارت نہ بنی تو ان کا کیا ہوگا۔؟

نواب چھتاری باریک کام میں مصروف ہیں

لیلئ وزارت کی سب سے زیادہ خواہش مند اگر کوئی جماعت ہے تو وہ ہے مسلم لیگ۔ اور جماعت اسلامی۔ جماعت اسلامی میں چونکہ یک طرفہ نامزدگی کا طریقہ رائج ہے۔ اس لئے وہاں تو کھلی رسہ کشی کا سوال ہی نہیں۔ تاہم نوجوانوں کا ایک حلقہ سابق صحافی اور موجودہ وکیل جماعت اسلامی حیدرآباد کے صدر غلام محمد کھوکھر کو منظر عام پر لانے کے لئے مقامی اخبارات میں لابی کرتے نظر آ رہے ہیں۔ اب ان نوجوانوں کو کون سمجھائے کہ بھائی! جماعتی وزارت اخباری لابی سے نہیں۔ راج گرد مولانا مودودی کی خوشنودی سے حاصل ہوتی ہے۔ اگر مودودی کی خوشنودی جان محمد عباسی اپنی ۲۰ سالہ خدمات کے بعد بھی حاصل نہ کر سکے تو پھر کھوکھر جیسے کل کے کارکن کیسے حاصل کریں گے؟

جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے ایک رسہ کشی تو، پرانے مسلم لیگیوں اور راتوں رات برآمد ہونے والوں میں پہلے ہی شروع ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بھی ایک رسہ کشی مارشل لائی وزیر محمد خان جونیجو اور سید ذوالفقار علی شاہ جاموٹ گروپ کے درمیان جاری ہے۔ جاموٹ صاحب سانگھڑ کے میر محمد وسان کو وزیر بنوانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف محمد خان جونیجو عبدالقادر سنجرانی کو وزیر بنوانے کے لئے سر توڑ کوشش میں مصروف ہیں عبدالقادر سنجرانی کو اس لحاظ سے اپنے حریف پر فوقیت حاصل ہے کہ وہ اس سے پیشتر بھی ایوبی دور میں وزارت کی کرسی کا تجربہ کر چکے ہیں۔ ۱۹۷۰ء کے انتخاب میں بھی کامیاب ہوئے تھے اور پیپلز پارٹی کے دور میں جب پیر پگاڑا اور مسلم لیگ کے عطا محمد مری، خلیفہ عاقل اور دیگر وفاداریاں بدل کر پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ عبدالقادر سنجرانی آخر وقت تک پیر پگاڑا کے وفادار بنے رہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ، وفاداریوں میں ثابت قدمی کام آتی ہے۔ یا نذرانہ۔

صوبائی وزارت کی باتیں چل رہی ہیں تو یہ بھی سنتے چلیں کہ بعض حلقے اس بات کے لئے بھی کوشاں ہیں پیپلز پارٹی میں سے کسی کو حکومت کی طرف توڑا جائے۔ انہیں سابق صوبائی وزیر اور ٹھٹھہ سے رکن بننے والے محمد خان سومرو بھی ایک ہیں۔ محمد خان سومرو پیپلز پارٹی میں میر رسول بخش تالپور گروپ کے کوٹے میں ہی صوبائی وزیر مقرر ہوئے تھے۔ چنانچہ جب میر رسول بخش تالپور نے گورنری سے استعفیٰ دیا تو محمد خان سومرو نے بھی وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ لیکن بعد میں ڈھیسر سندھ ممتاز علی بھٹو کے، گروپ میں شریک ہو گئے اور موجودہ مارشل لاء لگنے تک پیپلز پارٹی اور ممتاز علی بھٹو سے تعلق میں ثابت قدم ہے اس ثابت قدمی کے نتیجہ میں انہیں طویل عرصہ تک نظر بند رہنا پڑا اور ابھی حال ہی میں جیل سے باہر آئے ہیں لیکن ان کے معاملات ابھی احتسابی ٹریبونل میں زیر تصفیہ ہیں۔ ان کی ثابت قدمی دیکھتے ہوئے اب بھی دل یہی کہتا ہے کہ پیپلز پارٹی سے ان کی وفاداری توڑنا مشکل ہے۔ لیکن لمحہ بہ لمحہ بدلتے حالات میں اب کسی بات کا اعتبار نہیں رہا ہے۔ جال پڑا ہے۔ پھنسیں یا نکل جائیں۔ اب یہ وقت ہی بتائے گا۔؟

سیاسی پارٹیوں اور وزراء کے گرد افراد نے سرکار سے قربت کا فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ اس سلسلہ میں ابھی عید کے موقع پر سانگھڑ کا ایک واقعہ خاصا دلچسپ ہے۔ سانگھڑ میں میونسپل کمیٹی نے جنگی کا ٹھیکہ

انگریز نے "مارشل ریس" کا خطاب دیا

تم نے قوم کو مارشل لاء کا تحفہ دیا

ظفر قریشی

جسٹس کیانی کے ساتھیو!
سوچو تم میں ایک آواز تھی

گارین نے کہا" ہاں — کیا تمہارا خیال ہے کہ وزیرِ جنگ کا انتخاب آسان کام ہے؟ جناب میں تین کابیناؤں سے متعلق رہا ہوں اور ایک مرتبہ صدر مملکت بھی رہ چکا ہوں۔ اپنے اس تجربے کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ وزیرِ جنگ کا انتخاب سب سے مشکل کام ہے اور ساری مشکلات کی جڑ یہی عہدیدار ہوتا تھا۔ میرے نزدیک تمام جرنیل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وزارتی کونسل کے سربراہ کی حیثیت سے جب میں نے کابینہ تشکیل دی تو ہم نے ایک ایسا عام جرنیل منتخب کیا جو سیاست کی ابجد سے قطعی ناواقف تھا اور اس کے انتخاب کی وجہ بھی اس کی یہی ناواقفیت تھی۔ اسے یہ تک نہیں معلوم تھا کہ پارلیمنٹ کے دو ایوان ہوتے ہیں۔ ہمیں پارلیمانی طریقۂ کار اسے سمجھانا پڑا، اسے بتانا پڑا کہ ایک وزارت جنگ ہوتی ہے جس کی پارلیمانی کمیٹی ہوتی ہے، خزانے کی ایک کمیٹی ہوتی ہے اور دیگر سب کمیٹیاں ہوتی ہیں۔ بجٹ پر بحث ہوتی ہے۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم یہ تمام باتیں کاغذ کے کسی پرزے پر لکھ کر دے دیں تاکہ وہ انہیں ازبر کر لے۔ لوگوں اور چیزوں کے بارے اس کی عدم واقفیت عبرت انگیز تھی۔ تاہم پندرہ دن کے اندر اندر ہم نے دیکھا کہ وہ سیاست کے تمام اسرار و رموز سے واقف ہو چکا ہے، تمام سینیٹروں اور وزراء سے اس کی دوستی ہو چکی ہے اور وہ ان کے ساتھ مل کر ہمارے خلاف سازشوں میں مصروف ہے۔ اگر صدر گریوی کی ہمیں حمایت حاصل نہ ہوتی اور اگر وہ تمام فوجیوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہ دیکھتے ہوتے تو وہ جرنیل ہمارا تختہ الٹ چکا ہوتا اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ بہت معمولی سا جرنیل تھا، دوسرے تمام جرنیلوں کی طرح۔ آہ۔ یہ کبھی مت سوچنا کہ وزیرِ جنگ کا عہدہ اتنی غیر اہم چیز ہے کہ جلد بازی میں یا سنجیدگی سے سوچے سمجھے بغیر کسی کے حوالے کر دیا جائے"۔

اناطول فرانس — اقتباس ماخوذ از "ریڈ للی"

تاریخ پاکستان کا واحد جج جس نے مرتے دم تک حلف نبھایا

۱۵ار نومبر ۱۹۶۲ء کو عدلیہ سے متعلق ایک ایسا شخص ہم سے جدا ہوا جس کو پاکستانی بالخصوص اور تیسری دنیا کے عوام بالعموم ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ کیوں یاد رکھیں گے، اس کی طرف تو میں بعد میں آؤں گا، لیکن چند جملوں میں مجھے اس حقیقت پر آنسو بہا لینے دیجیئے کہ ایک مہذب قوم کے پڑھے لکھے افراد کے جو اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہوں، کبھی سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ کہنے کے حوصلے کا اظہار نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ جب ان لوگوں کا جنہیں حقیقتاً بے خوف ہونا چاہیئے، یہ حال ہو تو عام آدمی کا کیا حشر ہو گا۔ کیا ملازمت اتنی بڑی چیز ہے؟ کیا زندگی "سچ" کے اظہار سے زیادہ اہم ہے؟ اس "سچ" کے اظہار کے نتیجے میں اگر جان چلی جاتی ہے تو اس صورت میں ملنے والی عظمت اتنی کمتر ہے کہ اعلیٰ ترین مناصب پر فائز یہ حضرات لمبے لمبے چغے پہنے، صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے سے بے نیاز ہو کر ہرانے والے کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں! حلف اٹھاتے اور اٹھواتے ہیں اور اس عمل کے دوران انہیں یہ خیال نہیں آتا کہ جس قوم نے انہیں یہ عہدے اور مناصب سونپے ہیں اس قوم کا قرض ہی ادا کر دیں۔ ابن الوقتی میں یقیناً بہت فائدے ہوتے ہیں، لیکن بڑے پیمانے پر ابن الوقتی ملک کی جڑوں کو کھوکھلا اور کمزور کرتی ہے۔ جسٹس ملک رستم کیانی اس ملک میں اقتدار کی رسہ کشی کی سیاہ تاریخ میں روشنی کا مینار تھے۔ انہوں نے ایک ایسے زمانے میں اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق لوگوں کو — پڑھے لکھے لوگوں کو (جن میں بدقسمتی سے جناب اے کے بروہی بھی شامل تھے) نظریۂ ضرورت اور بنیادی انسانی حقوق کے درمیان موجود زمین و آسمان کا فرق سمجھانے کا بیڑا اٹھایا جب کہ بہت کم لوگ اس کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ دھان پان سے اس آدمی نے ۱۹۶۱ء میں ہی ایک تقریر میں پاکستان کے دو لخت ہونے کی پیش گوئی کی تھی اور یہی نہیں بلکہ اپنے ہم پیشہ ساتھیوں کو بھی ان کی غلطیوں پر روکا اور ٹوکا تھا۔ ان کی تقریروں کے عنوان سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے وہ کس دلجمعی کے ساتھ اپنے مشن پر گامزن تھے مثال کے طور پر:

۱۔ میرا تصور — قانون کی حکمرانی کی حمایت۔
۲۔ سوچنے والے ہر شخص کا بوجھ — ذمہ داری کا بوجھ۔
۳۔ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان۔
۴۔ چند غلطیوں اور زیادتیوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔
۵۔ فرد اور معاشرے کے درمیان ربط۔
۶۔ بدنصیبی تنہا نہیں آتی۔
۷۔ کیا ہائی کورٹ میں آپ کا کوئی دشمن ہے۔

حلف لینے اور دینے والو! جانتے ہو کہ تم قوم کے مقروض ہو

۸۔ شیر کی غیر شاعرانہ دھاڑ۔

۹۔ پیشر، پارلیمنٹ اور رائے عامہ۔

۱۰۔ سیاسی خرگوش اور تنگ چڑھے بادشاہ۔

۱۱۔ کیا میں آزادی سے بول سکتا ہوں؟

۱۲۔ اقربا پروری سے بٹیا پروری تک۔

۱۳۔ شہری ضرورت بمقابلہ تہذیب۔

اس بے باک شخص کو، بعد میں غاصب قرار دیئے جانے والے ایک حکمران ایوب خان نے توڑ نے اور دھمکانے کی بہتیری کوششیں کی ہی تھیں، لیکن اس کے چمچے جن میں ہمارے محترم دانشور اور ناخدا کے مصنف جناب قدرت اللہ شہاب اور بھٹو دور کے ڈان کے ایڈیٹر اور ردٹی پلانٹ فیم جناب الطاف گوہر نے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب بھی ان سے مذکورہ بالا دونوں افراد کی زہر افشانیوں کا ذکر کیا جاتا وہ مسکرا کر ٹال جاتے اور کہتے "میں چھوٹوں کے منہ نہیں لگتا، میں تو ان کے آقا اور برائیوں کی جڑ پر وار کرتا ہوں۔

وہ وار کس طرح کرتے تھے، اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے۔

سی ایس پی ایسوسی ایشن اپنے سالانہ عشائیے کے موقع پر مہمان خصوصی کے طور پر سربراہ مملکت یا صوبے کی حکومت کے سربراہ کو مدعو کیا کرتی تھی۔ ۴ مارچ ۵۹ء کو سی ایس پی ایسوسی ایشن نے جس کے صدر جسٹس کیانی تھے، بزعم خود صدر مملکت بن جانے والے جنرل محمد ایوب خان کو مدعو کیا۔ اپنے خطبۂ استقبالیہ میں جسٹس کیانی نے اپنے مخصوص انداز میں ایک گھوڑ سوار ریٹائرڈ سارجنٹ کا ذکر کیا، جو خود کو کپتان کہلانے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ خود ساختہ کپتان کا ذکر ایک جملے میں مکمل ہو جاتا تو ٹھیک تھا لیکن جسٹس کیانی مزے لے لے کر اس کی عادتیں بیان کرتے رہے۔ جس پر جنرل ایوب خان نے جز بز ہو کر محسوس کیا کہ وہ فوج کا مذاق اڑا رہے ہیں، کیوں کہ عین ان ہی دنوں نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے آپ کو فیلڈ مارشل کے عہدے پر ترقی دینے کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے۔ جسٹس کیانی نے اپنا خطبۂ استقبالیہ یہیں ختم نہیں کیا بلکہ آگے چل کر کہنے لگے۔ "میری سالانہ تقاریر عجیب اہمیت اختیار کر گئی ہیں۔ پہلی مرتبہ تقریر کی تو ایک کمشنر معطل ہو گیا۔ دوسری تقریر کے بعد صوبائی کابینہ توڑ دی گئی اور تیسری تقریر کے نتیجے میں پوری حکومت کسی دھماکے کے بغیر گر کر ٹوٹ گئی اور مارشل لار آگیا۔" اس پر ظاہر ہے کہ محفل زعفران زار ہو گئی لیکن ایوب خان جسٹس کیانی کی جسارت پر پہلو بدلتے رہ گئے۔

جسٹس کیانی خود تو سول سروس ایسوسی ایشن کے صدر تھے، لیکن موقع ملنے پر اسے بھی آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ چنانچہ اسی خطبہ استقبالیہ میں انہوں نے کہا کہ "اب اگر آپ کو انڈین سول سروس کے بارے میں اندازہ لگانا ہو تو ذرا پاکستان کے سپریم کورٹ کی طرف دیکھئے۔ اس کے ۵ میں سے ۳ جج سول سروس ہی سے آئے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ کسی سامراجی حکومت نے انہیں اس ملک کے بے زبان عوام پر مسلط کیا ہے بلکہ اس لئے کہ مجھے اگر شمار نہ کیا جائے تو یہ ملک میں موجود بہترین ججوں میں سے ہیں یہ" جسٹس کیانی نے اپنا ذکر اس لئے کیا کہ سول سروس سے متعلق تینوں جج اسی وقت عشائیہ میں موجود تھے۔ اس کے بعد اسی خطبہ استقبالیہ میں جسٹس کیانی نے "مارشل لار کے بارے میں بھی اپنے زریں خیالات کا اظہار کرنا مناسب خیال نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کہ ساتھ ہی ساتھ میری باتوں سے یہ مطالبہ اخذ نہیں کیا جانا چاہیئے کہ مسائل کا حل فوجی طرز حکومت میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز حکومت باقی دنیا کے نزدیک قابل افسوس اور باعث معذرت حیثیت رکھتا ہے اور ملک میں ضرورت قرار دیا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے ضرورت سے ایک دن بھی زائد برقرار نہیں رکھنا چاہیئے۔ اور جب تک برقرار رہے۔ کوئی ایسا طریقہ وضع کیا جائے کہ لوگ اپنے اس ناقابل برداشت سیال مادہ کو کھنکھار کر تھوک سکیں جو ان کے نظام میں گڑبڑ پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ جس طرح تقریر کی صلاحیت قدرت کا ایک بڑا عطیہ ہے، اسی طرح تقریر کی آزادی، ایک بڑا حق ہے۔ اور اگر گلے میں خراش ہو جائے اور بات کرنا مشکل ہو تو انسان سرگوشی کرتا ہے۔ چنانچہ، جب زیادہ تعداد میں لوگ سرگوشیاں کرتے ہیں" تو انہیں افواہیں کہا جاتا ہے "۔

قارئین کرام، یہ خطبہ استقبالیہ ۴ مارچ ۱۹۵۹ء کا ہے۔ اور یہ وہ دور تھا جب سیاسی رہنما دبکے ہوئے ہوئے تھے، جب صحافی خاموش تھے، جب دانشوروں کے منہ بند تھے اور اب صورتحال میں ایک جج ایک غاصب کے سامنے عوام کے ان حقوق اور ان اداروں کے لئے لڑ رہا تھا۔ جن سے وہ محروم کر دیئے گئے تھے۔ یہ کہنا، غیر ضروری ہو گا کہ اس کے بعد ایوب خان نے اپنی جوابی تقریر میں کیسے کیسے رکیک حملے کئے تاہم غصے میں انہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ "تم نے خطبہ استقبالیہ بڑی محنت سے لکھا ہے، مجھے امید ہے کہ مقدمات کے فیصلے لکھتے وقت بھی اتنی ہی محنت سے کام لیتے رہو گے"۔

کراچی بار ایسوسی ایشن کے ایک عشائیہ میں جسٹس کیانی مہمان خصوصی تھے۔ ایسوسی ایشن کے اس وقت کے صدر نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں قصداً اور احتیاطاً، مارشل لار کا ذکر نہیں کیا تھا۔ لیکن جسٹس کیانی کہاں خاموش رہنے والے تھے اپنی جوابی تقریر میں انہوں نے کہا کہ "آپ کے دل میں جو کچھ ہے، اس کے بارے میں اگر آپ نے اگر سوچ لیا ہے تو میں مارشل لار سے پہلے کی بات کروں گا میں اپنے آبائی گاؤں میں تھا۔ جب مجھے مارشل لار کی آمد کی خبر ملی۔ بدقسمتی تنہا نہیں آتی بلکہ بٹالینوں میں آتی ہے اور اس معاملہ میں تو پوری فوج ساتھ لے کر آتی ہے اس اطلاع کے ایک گھنٹہ بعد کسی کام کے سلسلے میں میری ملاقات ایک ایس پی سے ہوئی اور اس نے مجھے بتایا کہ مارشل لار کراچی سے کچھ زیادہ رقبے میں نافذ کیا گیا ہے جس میں پاکستان کے دو چھوٹے چھوٹے صوبے مشرقی اور مغربی پاکستان سماتے ہیں اس نے مجھے ایک اور معمولی لیکن قدرے دلچسپ خبر یہ بھی سنائی کہ آئین منسوخ کر دیا گیا ہے اور وزارتیں ختم کر دی گئی ہیں۔ اگر آپ نے ہوائی جہاز سے کبھی سفر کیا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ جب اچانک ہوائی جہاز ایک ہزار فٹ نیچے آتا ہے۔ تو مسافروں کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ میری اس وقت یہی کیفیت تھی۔ میں نے اداسی کے عالم میں اپنے باغیچے کا رخ کیا اور ایک باڑھ کو تراشنے لگا۔ بے خیالی میں میری انگلی زخمی ہو گئی اور خون رسنے لگا۔ خون دیکھ کر مجھ پر ملک کی سیاسی صورتحال واضح ہو گئی اور میرا دل خون ہو گیا"۔

"(بعد میں) سپریم کورٹ کا فیصلہ آیا کہ۔ کامیاب انقلاب خود اپنا جواز پیدا کرتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ کیونکہ اس فیصلے کی ذمہ داری (ہائی کورٹ سے بڑی) ایک عدالت عالیہ پر تھی۔ حضرات آپ نے اپنے خطبۂ استقبالیہ میں مارشل لار کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے غالباً اس خوف سے کہ کہیں کسی مارشل لار کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔ لیکن آپ نے بنیادی حقوق اور ہائی کورٹ کے اختیار کا ذکر تو کیا ہے، تو جہاں تک

باقی صـ۲۵ پر

بیگم بشیر نارو

خواتین کی جمہوری جدوجہد میں ایثار کی مثال

بھٹو سے محبت کی سزا

پورے خاندان کو مل چکی ہے

محمد نواز خلجی

صوبہ سندھ کے سیاسی و سماجی حلقوں میں بیگم ڈاکٹر بشیر نارو کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ بیگم نارو سکھر کے مشہور سماجی کارکن ڈاکٹر بشیر صاحب کی اہلیہ ہیں وہ شروع ہی سے خواتین کی فلاح بہبود کے کاموں اور سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی رہیں۔ جب پیپلز پارٹی وجود میں آئی اور چیئرمین بھٹو میدانِ عمل میں آئے تو بیگم نارو بھی جمہوریت کے اس قافلہ میں شامل ہو گئیں پھر وہ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور بے لوث خدمات کے باعث سندھ اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ عوامی حکومت کے خاتمہ اور مارشل لاء کے نفاذ کے بعد قائم مقام چیئرمین بیگم نصرت بھٹو نے بیگم نارو کو خواتین پیپلز پارٹی صوبہ سندھ کے لئے جنرل سکریٹری نامزد کیا۔ فوجی حکومت نے جہاں پارٹی کے دوسرے کارکنوں اور رہنماؤں کو پابندِ سلاسل کیا وہیں بیگم نارو بھی حکومتِ وقت کے ستم کا نشانہ بنیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ لیکن ان کے ارادے متزلزل نہ کر سکے۔ ہم ان سے کی گئی گفتگو قارئین کی دل چسپی کے لئے نقل کر رہے ہیں۔

گفتگو کے وقت ڈاکٹر بشیر بھی ہم میں شامل تھے۔ اس لئے پہلا سوال میں نے ان ہی سے کیا میں نے پوچھا ڈاکٹر صاحب بیگم صاحبہ ایک عرصہ سے سیاسی کارزار میں سرگرمِ عمل ہیں اس عرصہ میں کبھی ان کی سیاسی سرگرمیوں کے باعث آپ کو پریشانی اٹھانی پڑی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر بیگم صاحبہ کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھا اور کہا کہ یوں تو ایک شوہر کے لئے اس سے بڑی پریشانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ بیوی سیاسی تقریبوں میں مگن رہے اور شوہر اختر شماری میں مصروف لیکن ایک موقعہ ایسا بھی آیا جب مجھے ان کی سیاسی سرگرمیوں کے باعث ذہنی اذیت برداشت کرنا پڑی۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کے بعد جب پیپلز پارٹی کی ہائی کمان نے اپنے ورکروں کو ہدایت کی کہ وہ قائدِ عوام کی رہائی کے لئے مزاروں پر جا کر دعائیں مانگیں تو بیگم صاحبہ بھی ورکروں کے ساتھ مزاروں پر جانے لگیں اسی دوران بڑی لڑکی جو کہ شادی شدہ ہے اور میرے گھر پر ہی ٹھہری ہوئی تھی کی طبیعت خراب ہو گئی میں نے لیڈی ڈاکٹر کو بلوایا جس نے معائنے کے بعد بتایا کہ اب چند گھنٹوں میں ان کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا ہے۔ اسی اثناء میں سکھر مارشل لاء کے حکام کا ٹیلیفون آیا میجر اخلاق نے حکم دیا کہ چونکہ بیگم نارو کو ان کے گھر میں ایک ماہ کے لئے نظر بند کیا جا رہا ہے لہذا آپ اپنے تمام اہل خانہ کے ساتھ پندرہ منٹ کے اندر مکان خالی کر دیں میں نے میجر اخلاق کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے درخواست کی کہ اس حکم پر ایک رات کے لئے عمل درآمد روک دیا جائے یا پھر میری بچی اور لیڈی ڈاکٹر کو مکان میں رہنے کی اجازت دی جائے اگر آپ یہ بھی نہیں کر سکتے تو پھر بیگم صاحبہ کو جیل میں یا کسی اور جگہ نظر بند کر دیں۔ مگر میجر اخلاق نے میری بات ہی سننے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میرے پاس پندرہ منٹ کا وقت ہے اس عرصہ میں بیگم صاحبہ کے علاوہ تمام اہل خانہ مکان سے نکل جائیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ایسے میں کیا میری حالت ہوئی ہوگی دوسری طرف لیڈی ڈاکٹر نے بتایا کہ کسی لمحے بھی بچے کی ولادت ہو سکتی ہے ایسے میں زچہ کو حکم لے جانا نہایت خطرناک ہوگا مگر میں کیا کرتا حاکم حکم دے چکا تھا۔ لہذا مجبوراً دل پر پتھر رکھ کے زچہ کو گاڑی میں ڈالا اور اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاڑی چل رہی تھی میری بیٹی درد سے کراہ رہی تھی میرا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ یا خدا تو ہم سے کس قسم کا امتحان لے رہا ہے بھٹو سے محبت کرنے کی سزا اتنی بڑی تو نہیں ہو سکتی کہ ان کی زندگیوں کو عذاب میں مبتلا کر دیا جائے۔ خدا خدا کر کے اسپتال کا راستہ طے کیا۔ ڈاکٹر صاحب یہ کہتے کہتے جذباتی ہو گئے انہوں نے کہا کہ خلجی صاحب اب بتائیں کہ چادر اور چار دیواری کے تحفظ کا دعویٰ کرنے والی حکومت کس طرح اپنے کہے ہوئے الفاظ کی دھجیاں اڑا رہی ہے۔ ایسے موقعوں پر بڑے سے بڑا دشمن بھی چند لمحوں کے لئے اپنی دشمنی بھول جاتا۔ لیکن حکام یہ بھولنے کو تیار نہ تھے کہ بیگم نارو پیپلز پارٹی کی حامی ہے میرے پوچھنے پر ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں اس عرصہ میں اپنی ڈسپنسری میں رہتا تھا بچے ایک دوست کے مکان پر تھے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ مارشل لاء حکام نے گھر کے سامنے سے گذرنے پر بھی مجھ پر پابندی عائد کر دی تھی حتیٰ کہ عید قربان کے موقعہ پر بیگم صاحبہ کو بچوں سے ملنے نہیں دیا گیا مجھے سڑک پر دری بچھا کر بیٹھنا پڑا۔ وہیں قربانی دی اور گھر ہوتے ہوئے اپنے دوستوں سے سڑک پر عید ملنا پڑی۔

میں نے اب بیگم نارو سے پوچھا کہ آپ کو اس کے بعد بھی گرفتار کیا گیا تھا تو انہوں نے بتایا کہ پارٹی نے جب یوم جمہوریت منانے کا فیصلہ کیا تو مجھے پھر نظر بند کر دیا گیا تاکہ میں اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکوں لیکن ہم نے دیگیں پکوائیں جو کہ غرباء میں تقسیم کیں اسی دوران پولیس اور فوجی حکام میرے گھر میں گھس آئے ہمیں گالیاں دیں دھکے دیئے اور پھر مجھے ایک بار پھر اس وقت گرفتار کر کے سکھر جیل بھیجا گیا جب بھٹو صاحب کو سزا سنائی گئی۔ بیگم صاحبہ نے

بتایا کہ جیل میں انہیں قید تنہائی میں رکھ کر ذہنی اذیتیں پہنچائی پہنچائی گئیں۔ جس پر میں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ جیل حکام نے بھٹو کے سر کا واسطہ دے کر میری بھوک ہڑتال ختم کرائی۔ اس دوران مجھے مجبور کیا گیا کہ بھٹو کی حمایت سے کنارہ کش ہو جاؤں۔ اس سلسلے میں حکام نے دھمکیاں بھی دیں۔ سختیاں بھی کیں لالچ بھی دیئے کا خوف بھی دلایا لیکن ان کے ہر سوال اور ہر دھمکی کا جواب میں صرف جیئے بھٹو سے دیتی۔ جب میں بھٹو کا نام لیتی تو یوں محسوس ہوتا کہ میں سرکاری حکام کو گالی دے رہی ہوں۔ وہ کہتے کہ تم ہر بات میں بھٹو کا نام کیوں لیتی ہو میں جواب دیتی کہ وہ میرا قائد ہے اس ملک کے کروڑوں غریب محنت کش عوام کی امید ہے ان کے دلوں کی دھڑکن ہے۔ استحصالی قوتوں غریب ہاریوں مزدوروں کا خون چوسنے والے سرمایہ داروں جاگیرداروں کے لئے ایک بجلی ہے جو انہیں جلا کر بھسم کر دے گی۔ وہ لوگ میرے اس جواب سے چڑ جاتے اور پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ وہ میرے دل سے بھٹو ازم کو نہیں نکال سکتے۔ تو انہوں نے اس سلسلے میں بات کرنا ہی چھوڑ دیا۔ بیگم صاحبہ نے بتایا کہ جیل میں بیگم عبدالرزاق سومرو، غزالہ سومرو، شمل چانڈیو رقیہ سومرو، شیخاں خاتون بھی ان کے ہمراہ قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہی تھیں۔ ان کا جرم بھی یہ تھا کہ وہ بھٹو کو قائد مانتی تھیں شمل چانڈیو بیمار ہو گئیں جیل حکام نے ان کے علاج پر کوئی توجہ نہ دی مگر آفرین ہے ان کے حوصلے پر انہوں نے اُف تک نہ کی۔ اور نہ ہی ان کے عزائم میں لرزش پیدا ہوئی۔ بیگم صاحبہ نے ایک اور سوال کے جواب میں جماعت اسلامی کی غنڈہ گردی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میرا چھوٹا لڑکا اعجاز بشر نارو نشتر میڈیکل کالج ملتان میں زیر تعلیم ہے۔ اور لبرل اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا چیف ہے۔ گزشتہ دنوں جب نشتر میڈیکل کالج میں طلبہ یونین کے انتخابات ہوئے تو جماعت اسلامی کی بغل بچہ تنظیم جمعیت کو ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ جمعیت کو یہ شکست نشتر کالج کی ۲۵ سالہ تاریخ میں پہلی بار ہوئی تھی جس پر جمعیت والے چراغ پا ہو گئے لہٰذا جمعیت کے سانڈوں نے جن میں لیاقت بلوچ جمعیت کے مرکزی صدر کا بھائی بھی شامل تھا میرے بیٹے اعجاز بشر نارو پر قاتلانہ حملہ کر دیا اور چھرا گھونپ کر اسے شدید زخمی کر دیا۔ انتظامیہ نے کھلے بندوں حملہ آوروں کا ساتھ دیا۔ بھٹو کی محبت میں ہمیں ان گنت مصائب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ جوں جوں حکمران طبقہ ہم پر زیادتیاں کرتا ہے

توں توں ہمارے دلوں میں بھٹو کی محبت اور اس پر جان دینے کی آرزو میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ نے پیپلز پارٹی کی موجودہ تنظیم کے بارے میں بتایا کہ پورے ملک میں بھٹو کے شیدائی اور پیپلز پارٹی کے شیدائی موجود ہیں حالانکہ فوجی حکومت نے انہیں ختم کرنے کے لئے کوڑے مارے بھیڑ بکریوں کی طرح جیلوں میں ٹھونسا انہیں طرح طرح سے پریشان کیا لیکن اب تک وہ ایک بھی کارکن کے دل سے بھٹو کو نکالنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انہوں نے کہا کہ بھٹو کے جیالے شیدائیوں نے ٹکٹکی پر کھڑے ہو کر ہر کوڑے کے ساتھ جیئے بھٹو کا نعرہ بلند کیا۔ بیگم نارو نے کہا کہ یہ بونے سیاست دان اور نوکر شاہی کے پرزے کل پرزے اس ملک سے بھٹو ازم کو ختم نہیں کر سکتے بھٹو آزادی کی علامت بن چکا ہے۔ بیگم صاحبہ نے کہا کہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ اس ملک میں سیاسی کارکنوں کو کوڑے مارے جا رہے ہیں جب کہ اخلاقی مجرموں کو کوڑوں کی سزاؤں سے مبرا قرار دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ نوکر شاہی نے اس ملک کے حکمران طبقے کو اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار کر دیا ہے کہ کیوں کہ اس ملک میں صحافیوں تک کو کوڑے مارے گئے۔ یہ کوڑے صحافیوں کی پیٹھ پر نہیں پڑے بلکہ یہ کوڑے پاکستان کے وقار پر پڑے، صحافیوں پر برسنے والے کوڑے پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ سیاہ لفظوں میں لکھے جائیں گے بیگم صاحبہ نے پُرعزم لہجے میں کہا کہ فوجی حکمران اور باشتنے سیاست دان اگر آج بھی انتخاب کرائیں تو پیپلز پارٹی بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گی باوجودیکہ اس کا قائد اس کے راہنما جیلوں میں بند ہیں تمام ذرائع استعمال کر کے ہمارے قائد اور راہنماؤں کی کردار کشی کی جا رہی ہے لیکن عوام جانتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ بیگم صاحبہ نے کہا اگر فوری انتخابات نہ کرائے گئے تو ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا کیوں کہ علیحدگی پسند عناصر سر اٹھا رہے ہیں۔ تمام ملک دشمن قوتیں متحد ہو چکی ہیں۔ پاکستان کی تشکیل کو ماننے والے اب دندناتے پھر رہے ہیں۔ فوجی حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لینے چاہئیں اور جتنا جلد ہو سکے۔ انتخابات کرا کے حکومت عوامی نمائندوں کے سپرد کر دی جائے۔ تاکہ ملک کو مزید تباہی سے بچایا جا سکے۔ جب بیگم نارو صاحبہ سے کوثر نیازی کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے نہایت نفرت سے جواب دیا کہ وہ ایک تعفن زدہ لاش ہے وہ جہاں بھی جائے گا وہاں بدبو ہی ہو گی یہی وجہ ہے کہ اسے کوئی

(باقی صفحہ ۵ پر)

آیتہ اللہ آقائے شریعت مدار

تقسیم ہند کے بعد پاکستان کو تسلیم کرنے والا پہلا ملک ایران تھا اور شہنشاہ ایران یکم مارچ ۱۹۵۰ء کو پہلی بار پاکستان آئے تھے۔ اس کے بعد سے ایران اور پاکستان میں ہر دورِ حکومت میں جو تعلقات استوار رہے ہیں۔ وہ ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ باہمی رفاقت کے اس طویل ترین عرصے میں شہنشاہ ایران نہایت پُرآشوب اور نازک ترین لمحات سے گذرے ہیں جن میں ان کی ملک بدری بھی شامل ہے لیکن حالیہ واقعات ایران اور شہنشاہِ ایران کے لئے فیصلہ کن لگتے ہیں کیوں کہ بعض یورپی ممالک، مشرقِ وسطیٰ اور ایشیا میں بڑی سرعت سے حیرت انگیز انقلابی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور ان ملکوں کے سیاسی اور معاشی ڈھانچوں میں رد و بدل کے واقعات سالوں سے ہفتوں میں اور مہینوں سے گھنٹوں میں سمٹ آتے ہیں۔ ایران کی موجودہ صورتِ حال کے بارے میں یہ سوال چند ذہنوں میں ابھر رہا ہے کہ کیا وہاں ۵۳ء کی تاریخ دہرائی جائے گی جب شہنشاہ کو ملک چھوڑنا پڑا تھا یا ردِعمل کے طور پر ان کے پاؤں پھر سے سالوں تک کے لئے مضبوطی سے جم جائیں گے

فوج پر انحصار کر کے شاہ غیر یقینی جوا کھیل رہے ہیں (غیر ملکی مبصر)

آیۃ اللہ العظمیٰ آغائے روح اللہ خمینی

میں نے امام مہدی کو سرِراہے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے (شاہ ایران)

ذوالفقار رپورٹ

امریکہ میں "ایران ورکنگ گروپ" قائم کر دیا گیا: نیوز ویک

یہ سوال اس لئے ضروری محسوس کیا جا رہا ہے کہ اسلامی ملکوں کی تاریخ میں غالباً پہلی بار انتہا پسند مذہبی عناصر اور بائیں بازو کے عناصر باہم شیر و شکر ہو کر شہنشاہ کا تختہ الٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۵۳ء کا حوالہ یوں قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت وزیر اعظم ایران ڈاکٹر مصدق نے بائیں بازو کے نظریات رکھنے والی تودہ پارٹی کی مدد سے تیل کی برطانوی کمپنی کو قومی ملکیت میں لینے کے بعد ایسے حالات پیدا کر دیئے تھے کہ شہنشاہ کو ملک بدر ہونا پڑا تھا۔ اور آج بھی شہنشاہ کے خلاف ہنگاموں میں یہی پارٹی پیش پیش ہے اس گروپ میں آزاد خیال، ترقی پسند اور انقلابی رجحانات رکھنے والی پارٹیاں ہیں مثلاً ستارہ سرخ، سازمان چریکہائی فدائی خلق، نیشنل فرنٹ، ارمان خلق اور مجاہدین گوریلا تنظیم وغیرہ ہیں۔

مذہبی گروپ کی قیادت شہرہ آفاق شیعہ علماء کر رہے ہیں جن میں سرِفہرست جناب آیۃ اللہ آقائے روح اللہ خمینی ہیں جو عراق میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ انہیں شہنشاہ ایران نے ۱۹۶۴ء میں ملک بدر کیا تھا۔ ایران میں موجود علماء میں جناب آیۃ اللہ آغائے شریعت مدار اور جناب آیۃ اللہ یحییٰ ناصر نوری ہیں (موخر الذکر کو ۱۲ ستمبر کو گرفتار کر لیا گیا) بظاہر ان علماء کا شہنشاہ سے اختلاف مذہب اور عقیدے کی بنیاد پر نظر آتا ہے، جو ملک میں اسلامی نظام چاہتے ہیں اور اپنے مطالبات کے باعث شہنشاہ کے الفاظ میں قدامت پرست ہیں کیوں کہ انہوں (شہنشاہ) نے زرعی اصلاحات نافذ کی ہیں، عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق دیئے ہیں وغیرہ۔ اس کے جواب میں آقائے خمینی شہنشاہ کو قدامت پرست ٹھہراتے ہیں کہ انہوں نے ملک پر اپنی آمریت مسلط کر رکھی ہے اور زوال پذیر نظام کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ امریکی سامراجیت کے ترجمان ہیں۔ ملک کی زراعت اور معیشت کو تباہ کر دیا ہے۔ علماء اور بائیں بازو کے عناصر میں شہنشاہ کے خلاف ہنگاموں میں یہی ایک قدرِ مشترک ہے۔

شہنشاہ اپنے انقلابی رجحانات اور مذہبی عقیدے سے وابستگی کو ساتھ ساتھ رکھنے کا اظہار بار ہا کر چکے ہیں۔ خصوصاً اپنی خود نوشت سوانح "میرے دوست میرے دشمن" (غالباً ایوب خان نے اپنی کتاب "آقا نہیں، دوست" کا نام یہیں سے چرایا تھا) میں جہاں انہوں نے اپنے ولی عہدی کے زمانے کے انقلابی تصورات کا تذکرہ بڑی دلسوزی اور جہاں بانی سے کیا ہے، وہاں بڑے طمطراق سے عقیدے کی پختگی کا بھی ذکر کیا ہے۔ مثلاً "سوئٹزرلینڈ کے قیام کے دوران ہی میں نے ذہن میں ایسے خاکے بنانے شروع کر دیئے تھے جنہیں بادشاہ بننے کے بعد پالیسی کے طور پر نافذ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ملک کا نظم و نسق سنبھالتے ہی پہلے ہی دو تین سالوں میں مزارعین کا لگان ختم کر دوں گا جو شاہی زمینوں پر عرصے سے خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔ کسانوں کو ذاتی مکانوں اور مویشیوں کے لئے یکمشت رقم دی جائے گی۔ عوام کی شکایات کے لئے ایک صندوق تیار کرواؤں گا جس میں ہر شخص اپنی فریاد اور بپتا کاغذ کے ایک پرزے پر لکھ کر ڈال دے گا اور میں رات کو ان کا جائزہ لوں گا" وغیرہ وغیرہ۔

اپنی عقیدے سے وابستگی کے بارے میں شہنشاہ ایران لکھتے ہیں کہ ولی عہدی کا منصب سنبھالنے کے بعد جب وہ ٹائیفائڈ کا شکار ہو کر زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھے تو انہوں نے رات میں خواب میں سیدنا حضرت علیؓ کو دیکھا جن کے ایک ہاتھ میں ذوالفقار اور دوسرے

میں ایک پیالہ تھا جس میں کوئی سیّال مادہ تھا۔ حضرت علیؓ نے پیالہ انہیں دے کر پی جانے کا حکم دیا اور انہوں نے حکم کی تعمیل کی، صبح بخار ٹوٹ چکا تھا اور وہ تیزی سے صحت یاب ہو گئے۔ ایک مرتبہ (جب وہ بچے تھے) تو گھوڑا سواری کرتے ہوئے سر کے بل ایک چٹان پر گر گئے اور بے ہوش ہو گئے۔ انہیں گرتے ہوئے یوں محسوس ہوا جیسے حضرت عباسؓ نے انہیں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ وہ اپنے نگران کے ہمراہ شمران کے شاہی قلعہ کے قریب سے گذر رہے تھے کہ ایک بزرگ نظر آئے جن کے سر کے گرد ایسا ہالہ چمک رہا تھا جو حضرت عیسیٰؑ کی شبیہہ کے گرد نظر آتا ہے۔ شہنشاہ نے ان بزرگ کو پہچان لیا کہ وہ امام مہدی تھے جو ان کے نگران کو نظر نہ آسکے تھے۔ شہنشاہ کہتے ہیں کہ مجھے امام مہدی کو دیکھنے کا پورا یقین ہے اور عمر کے دوسرے مرحلوں میں بھی چار ایسے واقعات پیش آئے جن کے سبب مذہب پر میرا ایمان مضبوط تر ہو گیا۔

شہنشاہ ایران نے اپنی خود نوشت سوانح میں انتہا پسند مذہبی پیشواؤں کی مخالفت کا سرسری اور روس کی مداخلت کا شدت سے بار بار تذکرہ کیا ہے ممکن وہ ان دونوں کو مختلف خانوں میں رکھتے ہوں لہٰذا ایک بات بظاہر سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ایک حکمران کو بیک وقت مذہب پرست حلقے اور کمیونسٹ حلقے (بائیں بازو والوں کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے) کی مخالفت کا کیوں مسلسل سامنا کرنا پڑ رہا ہے؟ اس کا سادہ سا جواب دونوں گروپوں کے اس بنیادی مقصد میں شامل ہے کہ شہنشاہیت کا خاتمہ کر دیا جائے اور اب خونچکاں ہنگاموں نے یہ بات قطعیت سے ثابت کر دی ہے کہ ایران میں لوگ موروثی بادشاہت نہیں چاہتے۔ پھر وہ کیا چاہتے ہیں، اسلام کا روایتی نظام یا سیکولر طرز حکومت، یا ان کے بین بین جمہوری پارلیمانی نظام حکومت؟ اس سمت میں رہنمائی کے لئے جناب آیۃ اللہ خمینی کا وہ فتویٰ خاصی اہمیت کا حامل ہے جو انہوں نے ۲ر اکتوبر ۱۹۷۴ء کو عراق سے جاری کیا تھا جس کے اہم نکات یہ ہیں کہ ایران کے مسلمان "سامراجیوں اور صیہونیوں کے گماشتہ" شہنشاہ کی حکومت کا تختہ الٹ دیں۔ ایران میں تمام امریکی کمپنیوں اور یہودیوں کے زیر اہتمام ایران میں چلنے والے تمام اداروں، تنظیموں اور بلوں، اسرائیلی سفارت خانے اور دیگر مراکز اور ایران سے تیل لے جانے والے جہازوں کو تباہ کر دیں۔

جناب آقائے خمینی کے عزائم ان کے اس انٹرویو سے بھی ظاہر ہیں جو انہوں نے چند ماہ قبل فرانسیسی روزنامہ "لی ماندے" کو دیا تھا۔ اس میں انہوں نے کہا تھا کہ ایران میں بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریہ قائم کی جائے گی۔ حضرت رسالت مآبؐ اور حضرت علیؓ کے طرز پر اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ غاصبوں سے دولت چھین کر غریبوں میں تقسیم کی جائے گی۔ حقیقی معنوں میں کسان کی بہبود کے لئے زرعی اصلاحات نافذ کی جائیں گی اور سامراجی اور صیہونی تسلط کو ختم کیا جائے گا۔ انٹرویو میں فلسطینی عوام کی مکمل حمایت کرنے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مردوں اور عورتوں کے مساوی حقوق کا دعویٰ بھی کیا گیا ہے۔

بائیں بازو کی تنظیمیں کی سرخیل تودہ پارٹی اپنا بنیادی

مجھے جمی کارٹر کے انسانی حقوق کے منشور پر یقین نہیں ہے

(آقائے خمینی)

نصب العین سوشلزم بتاتی ہے اور اس کے پروگرام میں شہنشاہیت کا خاتمہ اور جمہوریہ کا قیام، سرمایہ داری، جاگیرداری اور سامراجی تسلط کا خاتمہ اور سیاسی و معاشی آزادی شامل ہیں۔ تودہ پارٹی دراصل کمیونسٹ پارٹی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ ایران میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد ۱۹۲۱ء میں ڈالی گئی تھی جسے ۱۹۴۱ء میں ختم کر کے اس کی جگہ تودہ (عوام) پارٹی قائم کی گئی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں وزیراعظم ڈاکٹر مصدق نے شہنشاہیت سے ٹکر لینے اور تیل کی برطانوی کمپنی کو قومی ملکیت میں لینے کے لئے اس پارٹی سے مدد اس لئے لی تھی کہ وہ سب سے زیادہ مضبوط اور فعال سیاسی پارٹی تھی لیکن جب وہ اپنے مقصد میں عارضی طور پر کامیاب ہو گئے اور شہنشاہ کو ملک سے راہ فرار اختیار کرنا پڑی تو وہ تودہ پارٹی کے ملک میں بنیادی انقلابی تبدیلیاں لانے کے مطالبے سے متفق نہ ہوئے جس کے نتیجے میں اس نے ڈاکٹر مصدق کی مکمل حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا لیکن جب شہنشاہ بیرونی طاقتوں اور بعض اندرونی عناصر کی مدد سے تخت پر دوبارہ قابض ہو گئے تو ڈاکٹر مصدق اور ان کی پارٹی نیشنل فرنٹ کے ساتھ تودہ پارٹی پر بھی عتاب نازل ہوا۔ ڈاکٹر مصدق کا حشر سب کو معلوم ہے اور تودہ پارٹی کے رہنماؤں کا قتل اور پابند سلاسل ہونا بھی دنیا کے سامنے ہے۔ اس کے ایک اہم رکن صفر قہرمانی ۳۱ سال سے جیل میں ہیں۔ وزیر خارجہ فاطمی کو پارٹی سے ساز باز کے الزام میں قتل کر کے ان کی لاش سڑکوں پر گھسیٹی گئی شہنشاہ کے خلاف ۱۹۵۳ء کی بغاوت کو کمیونسٹ غلبہ سے تعبیر کیا گیا، اور اس سے مذہب پرست عناصر کی جدوجہد کو یکسر خارج کر دیا گیا جن کی رہنمائی جلاوطن پیشوا جناب آقائے خمینی کر رہے ہیں۔

وزارت عظمیٰ جتنے تواتر سے ایران میں بدلی ہے اتنا بہت کم ملکوں میں پیدا ہوا ہوگا۔ شہنشاہ نے بار بار اپنے وزیراعظم بدلے لیکن جتنا تلخ تجربہ انہیں ڈاکٹر مصدق کے بارے میں ہوا، اتنا کسی اور سے نہیں ہوا چنانچہ وہ آج بھی ان سے متنفر ہیں۔ اپنی سوانح میں خصوصی طور پر بڑی تفصیل سے ڈاکٹر مصدق سے تذلیل کا پہلو اختیار کیا ہے اور دائیں بازو کے نظریات رکھنے والے دوسرے وزرائے اعظم کے لئے تعریفی جملے استعمال کئے ہیں جن میں محمد علی فروغی، رزم آرا، حسین اعلیٰ، احمد قوام اور جنرل زاہدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

ایران کی تاریخ شہنشاہیت میں ڈاکٹر مصدق نے ۱۹۵۳ء میں جو مثبت یا منفی کردار ادا کیا تھا وہ اس ملک کے لئے ناقابل فراموش رہے گا۔ شہنشاہ کی ان کے بارے میں جو رائے تھی اور غالباً اب بھی ہوگی۔ وہ مختصراً درج ہے۔ شہنشاہ اپنی سوانح میں لکھتے ہیں کہ حالات نے انہیں مصدق کی شخصیت کا گہرا مطالعہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بیرونی مداخلت (برطانوی اور روسی) کے مخالف سمجھے جاتے تھے اور شہنشاہ کا خیال تھا کہ وزیراعظم بننے کے بعد وہ بیرونی مداخلت کے بغیر عام انتخابات کرا سکیں گے۔ ڈاکٹر مصدق نے اپنے وزیراعظم بننے کے لئے شرط پیش کی کہ برطانیہ کی رضامندی حاصل کی جائے۔ انہوں نے شہنشاہ کو بتایا کہ وہ روس کی رضامندی کی فکر نہ کریں۔ اس ملک میں انگریزوں کی رضامندی حاصل کرنا اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے باوجود شہنشاہ نے روس سے بھی رابطہ قائم کیا اور اس نے کوئی اعتراض نہ کیا لیکن برطانوی سفیر نے انتخابات کی مخالفت کی اور ڈاکٹر مصدق وزیراعظم بننے پر آمادہ نہ ہوئے۔ اس

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

بھٹو کا سایہ تمام کوششوں کے باوجود سیاسی افق پر غالب رہے گا

فنانشل ٹائمز لندن نے اپنی حالیہ اشاعت میں پاکستان کے بارے میں ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا تھا۔ درج ذیل مضمون اسی خصوصی اشاعت میں شائع ہوا تھا جسے ہم قارئین کی نذر کر رہے ہیں

۱۹۷۷ء کے آغاز میں پاکستان میں جو سیاسی موڑ نمودار ہوا تھا، اس نے آج بہت سے سیاستدانوں اور ان کی جماعتوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں الجھن میں ڈال دیا ہے، آیا ان کا کوئی مستقبل ہے بھی۔ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نہ صرف اس وجہ سے کہ "انتخابات میں دھاندلیوں" کا الزام دے کر اس کی مذمت کی جا رہی ہے بلکہ ملک کی تاریخ میں پہلی بار مختلف خیالات اور نظریات کی حامی جماعتیں اپنے اختلافات بالائے طاق رکھ کر صرف ایک مشترکہ مقصد کے لئے کہ جناب بھٹو اور ان کی برسر اقتدار جماعت کو اقتدار سے محروم کر دیا جائے، متحد ہوئی تھیں۔

نو جماعتیں جو مختلف سیاسی فکر اور نظریات رکھتی تھیں پاکستان قومی اتحاد کے نام سے ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر کام کرنے لگیں۔ اب سترہ ماہ کے بعد بھی پی این اے موجود ہے لیکن صرف اس کا نام باقی رہ گیا ہے اور اس کے لیڈروں کو اس کا یقین نہیں کہ وہ اب بھی اپنے بنیادی مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ جناب بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی آج بھی ایک اہم سیاسی قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔

مارچ سے اکتوبر تک کے واقعات ایک اہم

اقتدار کے بھوکے اور لالچی عوام میں اپنی ساکھ کھو بیٹھے ہیں

تحریر: ڈیوڈ، ڈوڈویل
ترجمہ: عبدالمجیب خاں

کسی فوجی حکومت نے اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل ...

دستاویز بن چکے ہیں۔ جیسا کہ انتخابی نتائج کا اعلان کیا گیا، کہ جناب بھٹو اور ان کی پیپلز پارٹی نے قومی اسمبلی کی دو سو نشستوں میں سے ۱۵۵ نشستیں حاصل کی تھیں اور قومی اتحاد نے صرف ۳۶ نشستیں حاصل کیں، جس پر سارا ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ قومی اتحاد کے حمایتی سڑکوں اور گلیوں میں آگئے اور انتخابات میں دھاندلیوں کا دعویٰ کیا جانے لگا۔ اور ان میں سے بہت سے اب ثبوت کے طور پر جنرل ضیا کی فوجی حکومت کے جاری کردہ قرطاسِ ابیض کو یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ اس میں ہمارے دعویٰ کی واضح نشاندہی موجود ہے۔

۷ مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کو رد کر کے انہوں نے دوبارہ الیکشن کا مطالبہ کیا۔ پی این اے کے حمایتیوں نے سرکاری ٹیکسوں کی ادائیگی بند کر دی۔ سڑکوں اور گلیوں میں مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اور اپریل کے وسط میں پیپلز پارٹی کے زعماء اور کارکنوں کے گھروں پر حملے ہونے لگے۔ اور جون کے وسط تک پی این اے کے کارکنوں کی ایک بڑی تعداد کو جیلوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ جناب بھٹو بدستور دوبارہ انتخابات کرانے کے مطالبہ کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے رہے۔ اور انہوں نے امن و امان برقرار رکھنے کے لئے مسلح افواج سے رجوع کیا۔ کراچی، حیدرآباد اور لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔

بالآخر جب پی این اے کے رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات شروع ہوئے۔ اس وقت تک اصل تنازعہ کنٹرول سے باہر ہو چکا تھا۔ جولائی کے پہلے چار دنوں میں جناب بھٹو اور پی این اے کے رہنماؤں نے اصل مسئلے کا حل تلاش کرنے کی غرض سے رات گئے تک مذاکرات کئے۔ لیکن آیا انہوں نے اپنے اختلافات کا کوئی سیاسی حل تلاش کر لیا تھا؟ آج بھی بعض لوگوں کی زبان پر یہ سوال موجود ہے۔ کیونکہ ۵ جولائی کو چیف آف آرمی اسٹاف جنرل ضیاالحق نے جناب بھٹو کو اقتدار سے محروم کر دیا۔ انہوں نے آئین کو معطل کر دیا، اسمبلیاں توڑ دیں، سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی اور مارشل لا نافذ کر دیا۔

قومی اتحاد نے ملک میں مارشل لا کے نفاذ پر اطمینان کی سانس لی۔ اور اس کا بھرپور انداز سے خیر مقدم کیا۔ اور حقیقتاً یہی وہ نقطہ آغاز تھا جہاں سے اس کا عروج شروع ہوتا ہے۔ چھ ماہ سے یہ ایک غیر متوقع سیاسی قوت کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ بالآخر جناب بھٹو کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ اور اس بات کا انتظار تھا کہ حالات معمول پر آتے ہی از سرِ نو انتخابات کرا دیئے جائیں۔ دونوں مقاصد بظاہر ایسے نظر آرہے تھے کہ وہ انہیں فوراً پورا کر دیں گے۔ جنرل ضیا حالات معمول پر لے آئے تھے اور انہوں نے "نوے دن" کے اندر از سرِ نو انتخابات کرانے کا عہد کیا تھا لیکن اب تقریباً چار سو دن گزر چکے ہیں اور ابھی تک انتخابات منعقد نہیں کئے گئے۔ اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کے کوئی نمایاں آثار نظر آرہے ہیں۔ پرانے تنازعات، جنہوں نے پی این اے میں شامل جماعتوں کو تقسیم کر رکھا تھا پھر ابھر کر سامنے آگئے۔ چنانچہ اب "اتحاد" کا صرف نام باقی رہ گیا ہے۔

یہ جاننے کے لئے کہ ایسا کیوں ہوا، یہ ضروری ہے کہ ان جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کا، جنہوں نے پی این اے بنایا تھا۔ اور یہ سمجھنے کے لئے کہ جنرل ضیا نے 'آزادانہ انتخابات' کے ارادے کو ترک کر کے خود اقتدار پر قابض رہنے کو کیوں فوقیت دی؟ جائزہ لیا جائے۔

پی این اے میں شامل پانچ جماعتیں پی ڈی پی، خاکسار، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور آزاد

جموں و کشمیر مسلم کانفرنس چھوٹی چھوٹی جماعتیں تصور کی جاتی ہیں اور ان جماعتوں کو علاقائی سطح پر محدود پیمانے کی حمایت حاصل ہے، یا پھر یہ مکمل طور پر فردِ واحد کے زیر اثر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کا جھکاؤ اسلامی اور متعصبانہ اعتقاد پر ہے۔ جب کہ بقیہ چار جماعتیں جماعتِ اسلامی صرف ایک مضبوط تنظیمی بنیاد رکھتی ہے اور اس کے لیڈر میاں طفیل محمد وسیع پیمانے پر لوگوں کی حمایت حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ تحریک استقلال صرف ائیر مارشل اصغر خان کی وجہ سے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اور اس میں پارٹی تنظیم کا فقدان ہے۔ این ڈی پی دراصل کالعدم نیشنل عوامی پارٹی کی خاک سے وجود میں آئی ہے، جس کے رہنما خان عبدالولی خان تھے۔ پاکستان کے دو صوبوں سرحد اور بلوچستان میں اسے خاصی مقبولیت حاصل ہے۔ اور اس کے قائد ایک بلوچ شیرباز مزاری ہیں۔ مسلم لیگ کو قیام پاکستان کی وجہ سے تاریخی اعتبار سے اہمیت حاصل ہے لیکن اسے صرف اپنے ابتدائی دنوں کے اقتدار کا سایہ حاصل رہا ہے۔ اب اس کے قائد پیر پگارا ہیں۔ یہ جماعت بھی اسلامی نظریات کا پرچار کرتی ہے، لیکن بغیر اعتقاد کے۔ جناب بھٹو کو اقتدار سے محروم کر دینے کے بعد پی این اے کے جغادریوں کی اصل کمزوریاں کھل کر سامنے آنا شروع ہوگئی ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ جنرل ضیا پیپلز پارٹی کو دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کا موقع نہیں دیں گے۔ جب کہ جناب بھٹو سے بھی اس حق کو چھین لیا گیا ہے۔ اور تب ہی ان پارٹیوں پر مشتمل ایک نئی حکومت بھی تشکیل دی جا سکتی ہے۔ لیکن ان میں سے کسی نے بھی اس سلسلے میں قوم کی رائے دریافت کرنا گوارا نہیں کیا اور نہ ہی انہیں اب کوئی خاص حمایت حاصل ہے لیکن بظاہر انہیں سرکاری جماعت کا درجہ ضرور دیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ جنرل ضیا نے جب عام انتخابات کے لئے نئی تاریخ کا اعلان کیا اور سیاسی سرگرمیوں کو بحال کرنے کی اجازت دی تو یہ بات جلد ہی واضح ہوگئی کہ اصل مقابلہ جناب بھٹو اور فوجی حکومت کے مابین تھا۔ پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔ اور اس کی مقبولیت اس وقت اور بھی بڑھ گئی جب جنرل ضیا نے اسے دبانے کی کوشش کی اور جناب

بھٹو کے خلاف ایک پرانے قتل کا الزام عائد کر کے انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ ضمانت کی اپیل کامیاب ہو جانے کے بعد انہیں دوبارہ پھر گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن اس بار انہیں مارشل لا ریگولیشن ۱۲ کے تحت گرفتار کیا گیا، اس دوران پی این اے ایک تماشائی بنی ہوئی تھی، جناب بھٹو اس انتخابی مہم پر مکمل طور پر چھائے رہے، حتیٰ کہ پی این اے کو انتخابات ملتوی کرنے کا مطالبہ کرنا پڑا۔ اور جنرل ضیاء نے انہیں خوش کرتے ہوئے سیاسی سرگرمیوں پر از سر نو پابندی عائد کر دی۔ دراصل انتخابات ملتوی کر دینے کی بعض سیاسی وجوہات تھیں۔ پی این اے کے لئے اصغر خان اور تحریک استقلال نے خامیاں پیدا کرنا شروع کر دی تھیں۔ ائیر مارشل اصغر خان کا نکتہ نظر یہ تھا کہ اب چند برسوں تک کے لئے ملک میں انتخابات نہیں ہونے چاہئیں جس کی وجہ سے پی این اے کا پورا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ انہوں نے خود ہی جنرل ضیاء الحق کی نئی حکومت میں اپوزیشن کا کردار ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

جنرل ضیاء الحق کے ایک سینیئر سیاسی مشیر ریٹائرڈ جنرل راؤ فرمان علی نے ان اختلافات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ فوجی حکومت کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اقتدار کسی منتخب حکومت کے حوالے کر دیا جائے۔ فوج میں لوگوں کو احکامات پر عملدرآمد کرنا ہوتا ہے اور وہ اپنے جنرلوں پر تنقید نہیں کر سکتے۔ عام انتخابات میں جنرل ضیاء نے تنقید کی اجازت دی، بلکہ جب سے انہوں نے اقتدار سنبھالا ہے وہ تنقید کو برداشت کر رہے ہیں۔ اور اگر وہ اس تنقید کی مزید اجازت دیں تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ان کے لوگ یہ محسوس کرنے لگیں گے کہ ان کی پوزیشن کمزور ہے اور اگر وہ اس کی اجازت نہ دیں تو پھر سول حکومت کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کا بھی کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔" لہٰذا ایک نامزد حکومت کو قابل قبول حد تک ترجیح دی گئی۔ یعنی "قومی حکومت" کا قیام جو سول سیاستدانوں اور فوجی جنرلوں پر مشتمل تھی۔ جو کسی حد تک نیم فوجی انتظامیہ کا کام کر سکے۔ قومی حکومت میں شامل اراکین کو اسی کی تلاش تھی، جس نے پی این اے کو بھی شدید دباؤ میں مبتلا کر دیا۔ ایک جانب تو پی این اے سختی کے ساتھ جمہوری حکمرانی پر کاربند تھی۔ جب کہ دوسری جانب وہی سیاستدان تھے جو اقتدار کے لالچی اور

(باقی صفحہ ۵ پر)

ذکر کچھ سانپوں کا

ابو ضیا اقبال
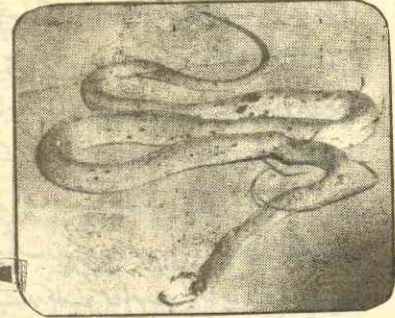
ستارہ اور مثلث کی طرح سانپ بھی صیہونیت کا علامتی نشان ہے جس کا مقصد سانپ کی سی چالاکی اور مکاری سے دنیا کو ہڑپ کر جانا ہے۔ اس کا سر یہودیت کے منصوبہ کاروں اور دھڑ یہودی قوم کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہودی مفکروں نے اس کی گذرگاہ بھی متعین کر رکھی ہے جہاں جہاں سے وہ علاقوں کو فتح کرتا ہوا گذرے گا۔

یہ تمہید اس لئے باندھی گئی ہے کہ ایک مذہب کے نزدیک سانپ کی افادیت اور اس کا مقام ظاہر کیا جائے جس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی اس عالم رنگ و بو کی، کہ سانپ انجیل مقدس کی رو سے باغ بہشت میں بھی باوا آدم اور اماں حوا کے ساتھ موجود تھا۔ یعنی اس کا تعلق ابلیس سے بنتا ہے۔ اور جب باوا آدم نے جنت سے نقل مکانی کر کے یہ شعر پڑھا ہو گا تو اس وقت سانپ بھی ان کے آس پاس ہی کہیں پھر رہا ہو گا اور ان کے آئندہ منصوبوں کی سن گن لے رہا ہو گا ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں
کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر،

قیاس اغلب ہے کہ سانپ کو یہ نوٹس پسند نہیں آیا ہو گا۔ چنانچہ اس نے اولاد آدم کو ڈسنا شروع کر دیا۔

بتانے والوں نے سانپ کی سینکڑوں قسمیں بتائی ہیں لیکن یہاں نہ کوئی سانپ نامہ تصنیف کر کے بادشاہ وقت سے خلعت و انعام لینا مقصود ہے نہ سانپ پر تھیسس لکھ کر اور ڈگری لے کر کوئی عہدہ حاصل کرنا مطلوب ہے، لہٰذا اس کی چند معروف اقسام کا تذکرہ ہی کافی ہو گا۔ ان میں ایک "اصلہ" ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا سر انسانی چہرے سے ملتا جلتا ہے اور انسانی سر جتنا بڑا ہوتا ہے۔ جس جگہ رہتا ہے وہاں گھاس نہیں اگتی۔ اگر جانور بھولے سے اس کے قریب آ جائے تو اس کا جسم سن ہو جاتا ہے اور وہ مر جاتا ہے انسان ہو یا حیوان، اس کے کاٹنے سے اس کا گوشت پوست پانی کی طرح بہہ جاتا ہے اور اسے بوقت **مرو یہ کہنے کی حاجت نہیں رہتی کہ عمر پانی پانی** کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات۔ اگر گھوڑے کو کاٹ لے تو وہ سوار سمیت فنا کا رخ کرتا ہے۔ اگر کوئی اسے لاٹھی سے مارے تو خود بھی مر جاتا ہے یعنی لاٹھی چارج کرنے والا بھی اپنے شکار کا خون دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہتا ہے۔ اس کی عمر ہزاروں سال بتائی جاتی ہے لیکن اس میں مبالغہ لگتا ہے کیونکہ ہزاروں سال کی عمر تو صرف نرگس کی ہی ہوتی ہے جو اپنی بے نوری پر روتی رہتی ہے تب کہیں جا کر چمن میں کوئی دیدہ ور پیدا ہوتا ہے۔

اسی قبیل کا سانپ "صل" ہے جس کے قریب سے پرند چرند گذر جائیں تو سیدھے دار فانی میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس کے آس پاس بھی سبزہ نہیں اگتا۔ رابرٹ گلبرٹ نے اپنی کتاب "سانپوں کی دنیا" میں ایک سانپ کا ذکر کیا ہے جو صرف امریکہ میں ہوتا ہے۔ جب یہ ڈستا ہے تو سارا جسم جھلس جاتا ہے اور سانس پر دانے نکل آتے ہیں۔ امریکہ میں ایک دو منہ والا سانپ بھی پایا جاتا ہے جو دونوں طرف سے چلتا ہے اور اگر درمیان کاٹ دیا جائے تب بھی دونوں حصے زندہ ر

سانپ پاکستان میں بھی ہوتا ہے۔

امام ابن جوزی اپنی کتاب "الاذکیا" میں ایک سانپ کا تذکرہ کرتے ہیں جو دوپہر کی کڑی دھوپ میں دُم ریت میں ٹھونس کر بانس کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے۔ کوئی شامت کا مارا پرندہ سستانے کے لئے اس پر آ بیٹھتا ہے تو وہ اسے ہڑپ کر جاتا ہے۔ علامہ دمیری اپنی تصنیف "حیٰوۃ الحیوان" میں فرماتے ہیں کہ ایک سانپ کے انڈے پر کسی صحابی رض کے بوڑھے والد کا پاؤں پڑ گیا اور ان کی بینائی فوراً جاتی رہی۔ رسولِ خدا نے ان کی آنکھوں پر اپنا لعابِ دہن لگایا تو بینائی عود کر آئی۔ "ابتر" اور "ذو الطفیتین" اسی قسم کے سانپ ہیں جنہیں صرف دیکھ لینے سے ہی انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ "ناظر" سانپ کو بھی دیکھنے والا فوراً مالکِ حقیقی سے جا ملتا ہے۔ "عربد" کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ چھوٹے سانپوں کو کھا جاتا ہے (جیسا کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کے ساتھ کرتی ہے یا بڑے بادشاہ چھوٹے بادشاہوں کو ملکِ عدم پہنچا دیتے ہیں)۔ اپنی جسامت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے اس سانپ کو کم از کم مچھلی کے برعکس اپنی برادری والوں کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے۔ ایک سانپ چھلانگ لگا کر اپنے شکار کو ڈستا ہے۔ یہ پاکستان کے ریتلے اور پہاڑی علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے اور نجانے کس نام سے پکارا جاتا ہے، البتہ عربی میں اس کا نام "احاد" یا "ابو یحییٰ" ہے۔ ان ناموں کی وجہ تسمیہ معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ اگر صرف یحییٰ ہوتا تو کیا حرج تھا؟

"مقرنا" کے سر پر چھوٹا سا سینگ ہوتا ہے۔ ایک سانپ کے سر پر تاج ہوتا ہے۔ وہ "مکلتہ الراس" کہلاتا ہے اور اسے دیکھتے ہی زہر چڑھ جاتا ہے۔ یہ تین بالشت کا ہوتا ہے۔ "ملک" نامی سانپ صرف بالشت بھر ہوتا ہے رنگ سبز ہوتا ہے۔ اس کی آواز سنتے ہی جانوروں کی رُوح فنا ہو جاتی ہے۔ "مو برک" خاکی رنگ کا ہوتا ہے اور اس سے راہگیر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ "رمتاء" کے جسم پر سیاہ و سفید نقطے ہوتے ہیں۔ "بوطیۃ" شاہ بلوط پر ڈیرہ ڈالتا ہے اور اس کے کاٹنے سے جلد گوشت سے جدا ہو جاتی ہے۔ اس کا نام "جدائیہ" ہونا چاہیئے تھا۔ "معطشہ" کے کاٹنے سے سارے جسم میں چنگاریاں سی بھر جاتی ہیں اور شدید پیاس لگتی ہے۔ "جان" کو دیکھ کر انسان ساری جان سے کانپنے لگتا ہے۔ ایک سانپ کا منہ زرد و سیاہ، گردن موٹی، بھویں دراز اور آنکھیں بڑی بڑی ہوتی ہیں گردن سے مار کھا گیا ورنہ آہو چشم، صراحی دار گردن اور بانکی چتون والا کہلاتا۔ اس کا نام "ثعبان" ہے۔

یہ سارے عربی زبان میں سانپوں کے نام ہیں اس لئے پاکستان میں بیشتر لوگوں کو ان کا علم نہیں ہو گا کیونکہ عام آدمی عربی سے اتنا ہی نابلد ہوتا ہے جتنا عربی دان علما کے مافی الضمیر سے۔ البتہ سانپوں پر ریسرچ کرنے والے حضرات ان کے مختلف ناموں، رنگ روپ اور خصوصیات کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں گے لیکن یہاں ذکر سانپوں کا ہے، سانپ کی پہچان رکھنے والوں کا نہیں۔

چینی سیاح ہیون سانگ نے اپنے سفرنامۂ ہندوستان میں سانپوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ دراصل ہماری معلومات میں جو کچھ بھی اضافہ ہوتا رہا اور ہو رہا ہے وہ بیرونی سیاحوں اور کہنے سننے والوں کے ذریعے، ورنہ ہمارے ہاں ہر زمانے میں گونگوں بہروں کی اکثریت رہی ہے جو بے چارے ہمیشہ بے بس اور دبائے رہتے ہیں

ہاں تو ہیون سانگ کو ہندوستان میں ایک جنگلی قبیلے کے سردار نے سانپ کا ایک جوڑا دکھایا جن کے جسم جب آپس میں رگڑ کھاتے تھے تو آگ پیدا ہوتی تھی، ایسے سانپ اگر اب ناپید نہیں تو نظر بھی نہیں آتے کیونکہ انہیں دکھانے والے جنگلی اب خاصے مہذب ہو گئے ہیں اور جنگل چھوڑ کر شہروں میں آن بسے ہیں یعنی اب وہ مردم خور نہیں رہے صرف مردم آزار رہ گئے ہیں۔

غالباً اسی قبیل کا سانپ لندن کے چڑیا گھر میں تھا جو دنیا کا سب سے بھاری سانپ یعنی بھینسوں کے وزن برابر تھا۔ جب وہ پھنکارتا تو اس کے منہ سے دھواں خارج ہوتا جو گرد و پیش کی چیزوں کو سیاہ کر دیتا تھا۔ شاید اس میں کسی دیو پیکر نیگرو کی رُوح سما گئی ہو گی۔ اگر لندن کی بجائے پاکستان میں ہوتا تو اس سے سفید کو سیاہ کرنے کا کام آسانی سے لیا جا سکتا تھا، اور لوگوں کو دوسروں کے چہرے سیاہ دکھانے میں کوئی قباحت پیش نہ آتی۔

جن سانپوں کو لوگ (خاص کر سپیرے) پکڑ لیتے ہیں (زندہ) اور ان کا زہر (یعنی کس بل) نکال دیتے ہیں وہ سانپ ان کے مطیع اور فرمانبردار بن جاتے ہیں، اور ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔ وہ جب بھی بین بجاتے ہیں تو پھن اٹھا کر جھومنے لگتے ہیں۔ ان کے اشارے پر کنڈلی مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے ذریعۂ معاش کا سامان بن جاتے ہیں۔ اس کے عوض انہیں بیٹھے بٹھائے بلا جد و جہد دودھ پینے کے لئے ملتا ہے۔ اور دودھ وہ شے ہے جس کے لئے فرہاد کو تیشہ اٹھا کر کوہ کنی کرنی پڑی تھی اور جو جنت میں بھی فراوانی سے ملے گا۔

بعض سانپوں کی آنکھوں میں مقناطیسی کشش ہوتی ہے جس سے مقابل ان کے سامنے بے دست و پا ہو جاتا ہے۔ بعض سنیاسی اور بیراگی ایسا سرمہ بھی دیتے ہیں جس سے آنکھوں میں مقناطیسی کشش پیدا ہو جاتی ہے گربہ مسکین (فارسی نہ جاننے والوں کے لئے بے ضرر بلی) کی آنکھوں میں بھی ایسی کشش بتائی جاتی ہے جسے کام میں لا کر وہ چوہے کو اپنے چھپے ہوئے ناخنوں سے دبوچ لیتی ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سانپ کینچلی بدلتا ہے جس سے اس کا رنگ روپ نکھر کر سامنے آتا ہے لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ اس کی دو زبانیں ہوتی ہیں۔ دراصل اس کی زبان درمیان سے کٹی ہوتی ہوتی ہے جس سے اس کے دو کنارے ہو جاتے ہیں۔ بھلا ایک منہ میں دو زبانیں کیسے رہ سکتی ہیں؟

پانی کے سانپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی عمر ہزار سال ہوتی ہے جو سراسر گپ لگتی ہے۔ کیونکہ یہ پانی میں سر اٹھا کر چلتا ہے اور کوئی سر اٹھا کر چلنے والا جاندار طویل عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا کہ عجب چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے۔ یہ اکثر کشتیوں پر حملہ کر کے انہیں الٹ دیتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سر ہمیشہ پانی کے اندر رکھتا ہو گا۔ حالیہ سیلاب میں بہہ کر آنے والا سانپ جس کی تصویر اخبارات میں چھپی ہے، شاید اسی نسل کا ہو گا۔ نہ جانے اس نے کتنی کشتیاں ڈبوئی ہوں گی۔

جن لوگوں کو محاورے ایجاد کرنے کا شوق تھا، انہوں نے اپنی آستینوں میں سانپ پالنے شروع کر دیئے تھے جس سے "آستین کا سانپ" محاورہ اردو زبان کو ملا۔

غالباً ۱۴ جون ۷۵ء کے "جنگ" میں خبر چھپی تھی کہ رحیم یار خاں کی حبیب کالونی کے ایک مردِ مجاہد محمد شریف حقہ فروش نے ایک رات میں ۹ انچ سے ۶ فٹ سائز کے ۵۶ سانپ ڈنڈے سے مار ڈالے۔ لاٹھی چارج کے اس بے بدل ماہر کو حقہ فروشی چھوڑ کر پولیس میں بھرتی ہو جانا چاہیئے تھا۔ خاصی ترقی پاتا۔

مینگل صاحب، یہ پنجاب کے نمائندے نہیں ہیں

انہوں نے اپنے گھروں کو بھرا ہے پنجابیوں کو بھوکا رکھا ہے

عطاء اللہ مینگل کا بیان پڑھا۔ انہوں نے وہی سب کہا ہے جو ایک غیرت مند انسان اس وقت کہتا ہے جب اسکے جذبات کو صد درجہ ٹھیس پہنچائی جائے۔ وہ ہم سے ناراض نہیں بالکل رُوٹھے ہوئے ہیں۔ بھائی آپ کی ناراضگی حق بجانب ہے۔ آپ سچے ہیں اس میں کوئی شک نہیں آپ پر مظالم ہوئے اور بہت زیادہ ہوئے۔ ہمارے ماننے یا نہ ماننے سے تاریخی حقیقت نہیں بدل سکتی۔ اوپر اوپر کی باتیں کرکے یا ہٹ دھرمی دکھا کر بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ ملک و قوم کی کچھ خدمت کر رہے ہیں، تو احمقوں کی دنیا میں بستے ہیں۔ انہوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا۔

جیسا کہ آپ نے کہا بالکل صحیح ہے ہمارا بنگالیوں کے ساتھ رویہ منصفانہ نہ تھا۔ بلاشبہ مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش بننے کی ذمہ داری صرف یحییٰ خان اور بھٹو پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ اس جرم میں کسی نہ کسی حد تک ہم بھی شریک ہیں۔ ہمیں اپنی غلطیوں کا اعتراف کرلینا چاہیئے۔ اسکے بعد ہی یہ ہوگا کہ ہم ان غلطیوں کو نہ دہرائیں۔ اگر سچی بات کہنے اور حق کی آواز بلند کرنے میں عظمت ہے تو سچی بات مان لینے میں بھی بڑائی ہے۔ یہ سچ ہے کہ بنگالیوں کے ساتھ ہم نے معاشی انصاف نہیں کیا۔ یقیناً دوسرے چھوٹے صوبوں کے ساتھ بھی انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ پچھلی حکومتوں نے بھی انہیں ان کا حق نہ دیا اور اب بھی وہی حال ہے۔ کیا تمام پاکستان کے عوام کی زندگی کا معیار ایک جیسا نہیں ہونا چاہیئے۔ کیا جو صوبہ پسماندہ ہے۔ اس پر ان صوبوں سے زیادہ توجہ نہیں دی جانی چاہیئے جو نسبتاً ترقی یافتہ ہیں؟ کیا ماضی میں ایسا ہوا؟ یا اب ایسا ہو رہا ہے؟ تمام صوبوں کو حق ہے کہ وہ اپنے وسائل کو اپنے استعمال میں لائیں۔ کیا انہیں حق نہیں کہ وہ بھی بیماری، جہالت اور غربت پر قابو پانے کے لئے اپنے ہی روپے کو اپنے اوپر خرچ کرسکیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرسکیں تو کیا یہ ان پر ظلم نہیں ہے، جو غریب آدمی کے ہاتھ سے روٹی چھین لیتا ہے کیا وہ ظالم نہیں ہے۔ اس سادہ سا سوال کا جواب کسی کو معلوم نہیں ہے؟ جو اس صورتِ حال کو جانتے ہیں وہ حقیقت بھی پہچانتے ہیں لیکن جو جان بوجھ کر نہیں مانتے وہ نہ صرف مفاد پرست اور خود غرض نہیں بلکہ کوتاہ اندیش بھی ہیں۔

مفاد پرستی اور خود غرضی انہیں ناک سے آگے دیکھنے نہیں دیتی۔ بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ یہ وہ بیوقوف عناصر ہیں جو جھوٹے اور جعلی تحفظ کے لئے اپنے آپ کو اور اپنی ہی آنے والی نسلوں کو داؤں پر لگا رہے ہیں۔ حق کو جھٹلا کر جھوٹے دعوے کرکے۔ دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھی تحفظ ملا کرتا ہے۔ ریت کی دیواریں بہت جلد گر جاتی ہیں۔ یقیناً بلوچ بھی پاکستان کے اتنے ہی باعزت شہری ہیں جتنا کوئی دوسرا ہو سکتا ہے، اپنا حق مانگنا غداری نہیں۔ بلکہ اپنے حق کے لئے لڑنا دنیا بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسلام میں تو اپنے حق کے لئے لڑنا ایک مستحق فعل ہے۔ یہ باتیں کوئی نئی نہیں، ہر سیاست دان جانتا ہے لیکن ہم عوام کو الّو بنانے کیلئے وہ کیا کہیں؟ کیا حکمران یہ کہیں کہ اصل لڑائی تو پیسے کی لڑائی ہے۔ اصل لڑائی تو پیسے کی ناجائز تقسیم کی ہے لڑائی تو اقتدار کی ہے۔ یہ حب الوطنی یا غداری تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو لوٹ مار ہے۔ آپ یقین جانیئے بھائی ہم پنجاب کے عام رہنے والے ان پڑھ اور سادہ لوح ہیں۔ پھر ہمارے ذرائع ابلاغ جیسے ہیں آپ جانتے ہیں۔ ساری صورتِ حال ہرگز ہرگز پنجاب کے عوام کو معلوم نہیں۔ ہماری بے خبری اور سادگی سے یہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

یہ مفاد پرست جو پاکستان بننے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی سے، صورتیں بدل بدل کر ہمارے مالک و مختار چلے آرہے ہیں ہمارے نمائندے نہیں ہیں۔ بھائی آپ کا شکوہ بجا، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں لیکن جنہوں نے آپ کے ساتھ ظلم کیا، کیا وہی ہمارے بھی مجرم نہیں۔ جنہوں نے آپ کے ساتھ بے انصافی کی، کیا انہوں نے ہمارے ساتھ انصاف کیا۔ جو آج بڑھ بڑھ کر بول رہے ہیں وہ ہماری زبان کیسے بن گئے ہیں۔ انہیں کس نے ہمارا نمائندہ بنایا۔ یہ ہم پنجابیوں کی بدقسمتی ہے کہ یہ مفاد پرست عنصر ہم پر چھایا رہا ہے اور چھایا ہوا ہے۔ وہ اپنے گھر بھر رہے ہیں اور ہمیں بدنام کر رہے ہیں، شاید ہماری بے خبری اور جہالت آپ کے یہاں سے بھی زیادہ ہے۔ ہماری اکثریت نہیں جانتی کہ دوسرے صوبوں میں رہنے والے ہمارے بہن بھائی اپنے لیل و نہار کس طرح گذارتے ہیں، ایسے کوائف اخباروں میں ارادتاً نہیں چھاپے جاتے۔ ہمارے خود غرض اور مفاد پرست حکمرانوں نے کبھی عوام سے یہ نہیں کہا کہ وہ کس طرح دوسرے صوبوں کا حق مار کر اپنے صوبے کے نام پر خود فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کیسے کیسے مظالم ہمارے بہن بھائیوں پر ڈھائے ہیں۔ افسوس صحیح تصویر ہمارے سامنے نہیں لیکن یہ سوچنے کی بات ہے کہ کیا مشرقی پاکستان کھو کر ہمارا صوبہ کچھ زیادہ امیر ہوگیا ہے۔ کیا وہاں سے لوٹ مار کرکے لائے ہوئے نجس روپے پیسے نے ہمارا معیارِ زندگی اونچا کردیا ہے؟ یا ہمیں سیاسی استحکام بخشا ہے؟۔

کیا ہم نے جو بین الاقوامی ذلت و رسوائی اٹھائی اس کی یہ قیمت ہے کہ شہروں میں چند بڑی بڑی عمارتیں بن جائیں اور چند لوگ ایرکنڈیشنڈ گاڑیوں میں گھومیں۔ ایک عام پنجابی ہرگز ہرگز ایسا بے غیرت نہیں۔ اس ذلت و رسوائی نے ہمارے سر شرم سے جھکائے ہیں۔ خدا کی قسم ہم اپنی ہی بے کسی پر حیران و پریشان ہیں جو ہمارے لوگوں نے ہی ہم پر مسلط کردی ہے، بھائی ہمارے تجربوں نے ہم کو بتا دیا ہے کہ سیاسی اور معاشی لوٹ مار کا انجام اچھا نہیں ہوتا ہم آگ سے کھیلنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہیں ہمیں معلوم ہے آپ حد درجہ پریشان ہیں لیکن ہم بھی بُری طرح پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمارے ہاتھ پیر بندھے ہیں ہم کیا کریں؟ ہم لوگ ہرگز اس کھیل میں ان کے ساتھ نہیں۔ پاکستان ہمارا آپ کا دونوں کا گھر ہے جب آگ لگتی ہے تو سب ہی جلتے ہیں البتہ کوئی زیادہ کوئی کم۔ ہم دونوں کو اپنے دُکھ بانٹنے کے لئے ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ بلکہ ہمیں آپ کی زیادہ ضرورت ہے آپ تو ہمارے غیرت مند بھائی ہیں۔

یہ وقت کسانوں کو دبا کر رکھنے کا ہے

نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر کی پولیس کو ہدایت

ملک میں موجودہ غیر نمائندہ حکومت اور جاگیرداروں سرمایہ داروں اور سامراج نواز افسر شاہی کے اس دور میں محنت کش طبقات کو کچلا جانا ایک فطری بات ہوتی ہے یہی وجہ تھی کہ نواب شاہ کے کسانوں کو علاقے کے زمینداروں نے وسیع پیمانے پر بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ کسانوں نے اپنے جائز مطالبات مقامی انتظامیہ کو پیش کئے لیکن کوئی تدارک نہیں ہوا۔ نتیجتاً نواب شاہ کے کسانوں نے پر امن بھوک ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ انتظامیہ پر واضح کیا جائے کہ ان کے مطالبات منصفانہ ہیں اور علاقے کے جاگیردار اور مقامی بالا افسر گٹھ جوڑ کر کے کسانوں کو زدوکوب کر رہے ہیں۔

اس سلسلے میں نواب شاہ کے کسانوں کے نمائندے اور سندھی ہاری کمیٹی کے سندھ آرگنائزنگ کمیٹی کے ممبر، غلام حسین شیر نے بتایا کہ مارچ ۸۰ ، ۹۱ء کے پہلے ہفتے میں وڈیرہ دین محمد زرداری نے جو قومی اتحاد کا ممبر رہا ہے، نواب شاہ کے دیہہ پہلی داد میں گھلو نامی ایک گاؤں پر کثیر تعداد میں، اپنے مسلح آدمیوں کی مدد سے حملہ کر دیا اور وہاں کے کسانوں کو بے دخل کرنے کے لئے وہاں تین دن تک فائرنگ ہوتی رہی۔ کسانوں نے خالی ہاتھوں ایک جاگیردار کے مسلح غنڈوں کا مقابلہ کیا اور مجبور ہو کر بعد میں اپنی زمینوں سے بے دخل ہو گئے۔ یہ کم سے کم ۶۰ کسانوں کے گھر تھے جو وہاں سے چھوڑ کر اپنی جان و مال کے تحفظ کے لئے گاؤں دیل سے چلے گئے۔ کسانوں نے گاؤں پر فائرنگ کا یہ واقعہ ۱۸ر مارچ کو رونما ہوا جبکہ کسانوں کو ہراساں کرنے کا سلسلہ بہت پہلے سے جاری تھا۔ جاگیرداروں کے اس حملے میں کسانوں کا ایک سرگرم ہاری یوسف گھلو گولی لگنے سے ہلاک ہو گیا اور بے شمار دیگر کسان اور ان کے گھر والے پریشان ہو گئے۔ کسانوں کو ایک تو اپنے گھروں اور زمینوں سے بے دخل کر دیا اور دوسرے یہ کہ ان کا بویا ہوا فصل اور روئی کے تین ہزار من وغیرہ وڈیرے دین محمد کے پاس پہنچ گئے۔ کسانوں نے سب سے پہلے وفود کی شکل میں مقامی انتظامیہ سے رابطہ قائم کیا اور ڈی ایم ایل اے نے مداخلت کی لیکن کسانوں کو نہ تو آج تک اپنے زمینوں پر واپس لایا گیا ہے اور نہ ان سے چھینا ہوا فصل واپس مل سکا ہے۔

دوسری طرف سکرنڈ تحصیل کی دیہہ گیارہویں راہب شاہ میں بھی اسی نوعیت کے واقعات ہوئے۔ وہاں کے وڈیرہ قاسم انڑ نے دیہہ گیارہویں راہب شاہ کے کسانوں کے ایک ہزار من گندم کی فصل کو ہڑپ کر گیا اور کسانوں کی روئی والی فصل کی ادائیگی سے صاف انکار کر دیا۔ جب کسانوں نے اپنا جائز حق مانگا تو وڈیرے قاسم انڑ نے کسانوں کے خلاف وسیع پیمانے پر کارروائیاں شروع کیں۔ اول تو انہوں نے دیہہ گیارہویں راہب شاہ کے کسانوں کے نمائندہ اور سندھی مزدور ہاری طلباء رابطہ کمیٹی نواب شاہ کے صدر حاجی حسین کے مکان پر دن دہاڑے ڈاکہ ڈلوایا اور اس کی بچی کے لئے جمع کیا ہوا جہیز ڈاکو لے گئے۔ بعد میں دیگر ہاریوں پر مظالم ڈھانے شروع کر دیئے اور آہستہ آہستہ ان کو بے دخل کر دیا گیا درحقیقت وڈیرہ قاسم انڑ نے ایک جھوٹے کلیم کے ذریعہ مقامی ریونیو آفیسروں سے ساز باز کر کے یہ زمین حاصل کی ہے جس پر کام کرنے والے محنت کش کسانوں کو بے دردی سے بے دخل کر دیا گیا ہے۔ اس صورتحال سے تنگ آ کر دیہہ پہلی دادا اور دیہہ گیارہویں راہب شاہ کے کسانوں نے ۱۴ر اگست سے نواب شاہ کے بڑے چوک پر پرامن بھوک ہڑتال شروع کر دی۔

ہاری لیڈر غلام حسین شیر نے مزید بتایا کہ ہڑتال کے ۵ ویں دن نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر نے کسانوں کے نمائندوں سے بات چیت شروع کی۔ ضلعی حکام نے مذاکرات میں کسانوں کو یقین دلایا کہ قاسم انڑ دراصل ایک بدمعاش وڈیرہ ہے جس کے پاس ایک جعلی کلیم ہے اور دیہہ پہلی دادا اور دیہہ گیارہویں راہب شاہ کے کسانوں کو زمینوں پر واپس لایا جائے گا اور ان کو اپنی فصل واپس دلائی جائے گی۔ بہرحال ڈپٹی کمشنر نے کسانوں سے درخواست کی کہ وہ ہڑتال ختم کر دیں کسانوں نے ہڑتال ختم کی لیکن ہڑتال ختم ہونے کے دوسرے دن وڈیرے دین محمد زرداری کے گھلو گاؤں کے کسانوں پر دوبارہ حملہ کر دیا اور فائرنگ کروائی۔ اس طرح وڈیرے قاسم انڑ نے کسانوں کو بے عزت کیا اور ان پر ڈنڈے برسائے۔ کسانوں نے دوبارہ ضلعی حکام سے رابطہ قائم کیا۔ لیکن خود ڈپٹی کمشنر بے بس نظر آ رہے تھے۔

غلام حسین شیر نے بتایا کہ نواب شاہ کے کسان مجبور ہو گئے کہ ہڑتال دوبارہ شروع کی جائے۔ اور ۱۹ر اگست سے، کسانوں نے پرامن بھوک ہڑتال شروع کی۔ ۲۱ر اگست کو صبح کے ۸ بج رہے تھے کہ نواب شاہ کی تقریباً پوری پولیس نے دیہہ پہلی داد اور دیہہ گیارہویں راہب شاہ کے چار گاؤں پر حملہ کر دیا۔ پولیس کے اس وحشی کارروائی کے واقعات بڑے بھیانک تھے پاگلوں کی طرح پولیس کسانوں کے گھروں میں گھس آئی اور خواتین اور بچوں کو ہراساں کیا بے شمار لوگوں کو گرفتار کیا جن میں خود زمینداروں کے لوگ شامل تھے جن کو بعد میں رہا کر دیا گیا۔ اس حملہ پر پولیس نے سندھ این ایس ایف کے صفدر رند کو بھی گرفتار کیا اور ہاری لیڈر حاجی حسین اور دیگر ہاری کمیٹی کے کارکنوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے۔ نوے برس کے کسانوں کو مار مار کر بے ہوش کر دیا گیا اور عورتوں کو زدوکوب کیا گیا۔

غلام حسین شیر نے کہا کہ نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر شرف علی جماعت اسلامی کے نوازے ہوئے آفیسر ہیں انہوں نے پولیس سے کہا ہے کہ یہ وقت ان کسانوں کو دبا کر رکھنے کا ہے اور زمینداروں کے خلاف ان کی طاقت کو کچل کر رکھنے کی ضرورت ہے اور اس طرح ظالم وڈیروں پولیس اور نوکر شاہی نے متحد ہو کر کسانوں پر بے دردی سے ظلم کیا ہے انہوں نے مطالبہ کیا کہ نواب شاہ کے کسانوں کی بے دخلیاں فوری طور پر بند کی جائیں اور بے دخل کسانوں کو واپس اپنی زمینوں پر آباد کیا جائے۔ دیہہ راہب شاہ اور دیہہ پہلی داد کے کسانوں کو اپنی فصل واپس دلائی جائے۔ وڈیرہ قاسم انڑ کا جعلی کلیم منسوخ کر کے زمین اپنے حقیقی مالکوں کو دی جائے۔ نواب شاہ کے ڈپٹی کمشنر کے خلاف کسانوں پر تشدد کرنے پر تحقیقات کرائی جائے۔ کسان لیڈر محمد یوسف گھلو کے قاتلوں کو عبرتناک سزا دی جائے گرفتار شدہ کسانوں کو رہا کیا جائے اور ہاری کمیٹی کے کارکنوں کے خلاف جاری کردہ وارنٹ منسوخ کئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ نواب شاہ کے کسانوں کے مطالبات پورے کئے جائیں کراچی کے صحافیوں کے ۸ نکاتی پروگرام پر عمل کیا جائے اور داؤد کارخانہ لیبر فیڈریشن کے مزدوروں کے مطالبات مان لئے جائیں ورنہ بگڑتے ہوئے حالات کے ذمہ دار خود حکام ہوں گے۔

طاہر اعوان • سیکرٹری۔ این۔ ایس۔ او

آنکھوں پر پٹی، نامعلوم جگہ، پاؤں میں زنجیریں

مجھے الٹا لٹکایا گیا، پانچ دن اور پانچ راتیں جگایا گیا

نیشلسٹ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن لاہور کے سکریٹری جنرل جناب طاہر اعوان نے صحافیوں کی حالیہ تحریک کے دوران اپنی کراچی میں گرفتاری کے بعد ان پر کئے جانے والے غیر انسانی سلوک کی داستان حسب ذیل الفاظ میں سنائی ہے۔

"میں نے ۲۰ اگست کو کراچی کے ریگل چوک میں مجاہدین صحافت کے ایک دستے کے ساتھ خود کو گرفتاری کے لئے پیش کیا۔ گرفتاری کے بعد مجھے ۴ گھنٹے تک پریڈی تھانے میں رکھا گیا۔ پھر ہتھکڑیاں پہنا کر اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر جیپ میں کسی نامعلوم مقام پر لے جایا گیا اور پیروں میں زنجیریں باندھ دی گئیں۔ جب میری آنکھوں پر سے پٹی کھولی گئی تو میں نے اپنے سامنے چند باوردی فوجیوں کو دیکھا جن میں سب سے سینیئر ایک حوالدار تھا۔ میرے پاؤں کی زنجیر کونے میں لگے ہوئے ایک کنڈے کے ساتھ بندھی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا سیل تھا جس میں کوئی روشندان نہیں تھا اور صرف ایک دروازہ تھا۔ میری جامہ تلاشی لی گئی اور کھڑا رہنے کا حکم دیا گیا اور ایک سنتری کے سوا سارے فوجی چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد سادہ لباس میں ایک شخص آیا اور اس نے آتے ہی مجھے ایک تھپڑ مار کر گرجدار آواز میں گالیاں بکنا شروع کر دیں اور کہا کہ تم صحافیوں کی غنڈہ گردی کو ہوا دے رہے ہو۔ تمہیں ابھی مزا چکھاتا ہوں۔ پھر اُس نے سنتری کو حکم دیا کہ اگر یہ حرکت کرے تو اُڑا دینا، اور چلا گیا۔ رات مجھے دو بدبودار کمبل دیئے گئے۔ جن میں سے ایک میں نے بچھا لیا اور دوسرے کو تکیے کی جگہ رکھ لیا۔ تھوڑی دیر بعد سنتری آکر مجھے آواز دیتا اور دیکھتا کہ سو تو نہیں رہا ہوں، اگر میری آنکھ لگ جاتی تو وہ انفل کا بٹ مار کر جگا دیتا۔ تقریباً ۱۲ بجے سادہ لباس میں ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ تم معافی مانگ لو اور آزادی صحافت کی تحریک کے خلاف بیان دو کہ تمہیں پیسے دے کر لاہور سے لایا گیا ہے۔ میرے انکار پر وہ آگ بگولہ ہو کر مجھے دھمکیاں دیتے اور گالیاں بکتے ہوئے چلا گیا۔

کچھ دیر بعد چند باوردی فوجیوں نے آکر میرے پاؤں کی زنجیر کھولی، ہتھکڑیاں پہنائیں اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ایک دوسرے کمرے میں لے گئے۔ وہاں اذیت رسانی کی مختلف چیزیں تھیں، مجھے موٹے موٹے رسّوں سے باندھ کر الٹا لٹکا دیا گیا اور تھوڑی دیر بعد وہی سادہ کپڑوں میں ملبوس گرجدار آواز والا شخص آیا اور حوالدار سے کہا کہ ابھی تک کارروائی شروع نہیں کی گئی؟ حکم ملتے ہی میری پٹائی شروع کر دی گئی یہاں تک کہ میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو پہلی والی کوٹھری میں پڑا تھا۔ یہاں مجھے فوجی لنگر سے کھانا اور گرم پانی دیا جاتا تھا۔ میں ہر وقت پسینے میں شرابور رہتا تھا۔ اور کپڑے میل سے چیکٹ ہو گئے تھے۔ مچھروں کی بہتات کی وجہ سے ایک پل چین نہ آتا تھا۔ حوائج ضروریہ کے لئے جانا ہوتا تو سنتری سے کہتا۔ وہ گارڈ کمانڈر کو بتاتا اور گارڈ کمانڈر چابی لے کر آتا۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنائی جاتیں اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر بیت الخلاء لے جایا جاتا۔

مسلسل ۹ روز تک یہی کیفیت رہی اور پانچ دن پانچ راتیں جاگتے رہنے سے میری حالت غیر ہو گئی اس دوران میں مختلف لوگ آتے اور مجھے مجبور کرتے کہ بیان دوں مجھے پیسے دے کر لاہور سے لایا گیا ہے اور صحافیوں کی یہ تحریک بیرونی طاقتوں کے اشارے پر چلائی جا رہی ہے۔ یہ لوگ مجھ سے گھنٹوں سوالات کرتے کہ لاہور سے اور کتنے لوگ آ رہے ہیں؟ ان میں این ایس او کے کتنے آدمی ہیں؟ وغیرہ۔ میرے بیان دینے سے انکار کرنے پر مجھے مختلف قسم کے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ اتنے دن تک میں شیو نہ بنا سکا تھا اور کپڑوں سے بُو اٹھنے لگی تھی۔ ۲۸ اگست کو اچانک مجھے نہانے کے لئے کہا گیا اور دوسرا جوڑا پہنایا گیا۔ اگلے روز میرے دُھلے ہوئے کپڑے واپس کئے گئے اور شیو کا سامان دیا گیا۔ اس کے بعد مجھے ایک شخص کے سامنے پیش کیا گیا جو سادہ لباس میں تھا لیکن کوئی سینیئر فوجی افسر لگتا تھا۔ اس نے کہا کہ تمہیں رہا کیا جا رہا ہے لیکن اگر باہر جا کر تشدد کے بارے میں کسی کو بتایا تو نتائج اچھے نہ ہوں گے۔ پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ اور جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ پٹی کھلنے پر میں نے خود کو دوبارہ پریڈی تھانے میں پایا۔ وہاں سے شام کو پولیس کے ایک باوردی اے ایس آئی اور تین سپاہیوں کی نگرانی میں ٹرین میں بٹھایا گیا اور سادہ لباس میں دو پولیس والے میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ یہ لوگ روہڑی جنکشن پر اتر گئے۔

مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والے سارے افراد سادہ لباس میں تھے اور صرف حوالدار کے عہدے تک وردی میں تھے۔ تاہم میں اس کیمپ اور اس کے انچارج کا نام معلوم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کیمپ کا نام "فیلڈ انٹروگیشن سینٹر" تھا۔ جو میں نے ایک فائل پر لکھا دیکھا تھا اور کیمپ انچارج کا نام میجر جمیل احمد تھا۔ یہ ہمیشہ سادہ کپڑوں میں ہوتا تھا"۔

جناب طاہر اعوان کی ناجائز نظربندی اور ان پر کئے جانے والے تشدد کی مذمت کے سلسلے میں نیشلسٹ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی مرکزی کمیٹی کا ایک اجلاس لاہور میں منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ انہیں حبس بیجا میں رکھنے اور جسمانی اذیت پہنچائے جانے کی اعلیٰ سطح پر تحقیقات کرائی جائے اور ان کی صوبہ بدری کے احکامات فی الفور واپس لئے جائیں۔

صحافت کے "داغدار" چہرے بے نقاب ہو گئے

شبیہ الحسن

اخباری صنعت کے کارکنوں نے پی ایف یو جے اپنک اور عوامی جدوجہد کمیٹی کی قیادت میں آٹھ نکاتی مطالبات کی حمایت میں جو تحریک شروع کی تھی اس کی مدت دو ماہ آٹھ روز ہو گئی ہے۔ اس سے قبل اپریل ۱۹۷۸ء کی جدوجہد ایک ماہ جاری رہنے کے بعد ۳۰ مئی کو مجلس عمل کی ہدایت پر عارضی طور پر معطل کر دی گئی تھی. اس طرح مجموعی طور پر تحریک کی مدت تین ماہ اور چند یوم ہو چکی ہے گرفتار ہونے والے صحافیوں، پریس کارکنوں مزدوروں، ہاریوں اور طلبہ کی تعداد ۲۴۵ تک پہنچ گئی ہے۔

اخباری کارکنوں کی اس عظیم اور ناقابل یقین، تحریک کو جہاں جہاں محنت کش طبقات کی بالخصوص اور عام طبقات کی بالعموم حمایت حاصل ہے۔ وہاں ملک کی بیشتر سیاسی پارٹیوں اور ان کے رہنماؤں نے گہری ہمدردی، حمایت اور تعاون کا یقین دلاتے ہوئے حکومت وقت پر زور دیا ہے کہ وہ اخباری صنعت کے کارکنوں کے مطالبات بلا تاخیر تسلیم کر لے اور پی ایف یو جے، اپنک کے حقیقی نمائندوں سے جلد از جلد مذاکرات کر کے محاذ آرائی کی فضا ختم کرے۔ کیونکہ اس تحریک کے سلسلے میں حکومت نے ابتک جس سرد مہری کا مظاہرہ کیا ہے اور "کچل دو" کی جو نفرت انگیز پالیسی اپنائی ہے۔ اس سے بیرون ملک پاکستان اس کے وقار اور اس کی ساکھ کو زبردست نقصان پہنچ رہا ہے۔ جن سیاسی رہنماؤں نے پی ایف یو جے اور اپنک کی تحریک کو جائز اور منصفانہ قرار دیتے ہوئے حکومت کو آٹھ نکاتی مطالبات منظور کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ ان میں این ڈی پی کے رہنما جناب غوث بخش بزنجو، تحریک استقلال کے سربراہ جناب اصغر خان، جناب اکبر بگٹی، جمعیت العلمائے پاکستان کے سربراہ جناب شاہ احمد نورانی جناب ظہور الحسن بھوپالی، بلوچستان کے رہنما شیر محمد مری، قومی محاذ آزادی کے رہنما جناب معراج محمد خان، مزدور کسان پارٹی کے رہنما جناب افضل بنگش، مزدور کسان پارٹی کے ممبر اسحاق پیپلز پارٹی کی قائم مقام چیرمین محترمہ نصرت بھٹو، سکریٹری جنرل فاروق لغاری، بے نظیر بھٹو، مولانا احتشام الحسن تھانوی، مولانا نجم الحسن کراروی کے علاوہ تمام طلباء، مزدوروں اور ہاری تنظیموں کی اخلاقی ہی نہیں بلکہ سرگرم حمایت حاصل ہے۔ اور ہمیں یہ کہنے میں عار محسوس نہیں ہوتا کہ اگر صحافیوں اور پریس کارکنوں کی وائٹ کالر یونینوں کو مزدوروں، ہاریوں اور طلباء کا عملی اور پرجوش تعاون ح...
حقوق کے حصول کی جدوجہد شائد اتنی...
اتنی طویل مدت تک جاری نہ رہتی ...
ہمیں یہی سبق دیا ہے کہ کوئی تحریک...
کی سرگرم اور عملی حمایت کے بغیر زیادہ...
چاہیے۔ وہ روزگار کی جدوجہد ہو...
کے حصول کی تحریک، کامیابی کے ا...
روشن ہوتے ہیں جب سارے مظلو...

مارشل ل...

"کچل دو" کی پالیسی سے ملک کی ساکھ کو نقصا...

مفتی محمود آمریت کے
جال میں
پھنس گئے ہیں

...ن حاصل نہ ہوتا تو، ...اتنی کامیابی سے ...تی - اس جدوجہد نے ...ریک محنت کش طبقات ...یادہ موثر ثابت نہیں ہوتی ...بد ہو یا بنیادی حقوق ...کے امکانات اس وقت ...مظلوم اور محنت کرنیوالے

...ان پہنچ رہا ہے

کندھے سے کندھا ملا کر حقوق غصب کرنے والے کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

ادھر قومی اتحاد کے سربراہ مفتی محمود کے اس بیان سے جس میں انہوں نے اتحاد کی حکومت پر زور دیا تھا کہ گرفتار صحافیوں اور ان کی حمایت کرنے والوں کو رہا کر دیا جائے اور نیشنل پریس ٹرسٹ کے بے روزگار کئے جانے والے صحافیوں اور پریس کارکنوں کو بحال کر کے پی ایف یو جے اور اپنک کے حقیقی رہنماؤں سے مذاکرات کئے جائیں، یہ امید بندھ چلی تھی کہ حکومت اس معقول تجویز کا نوٹس لے گی پی ایف یو جے کے سکریٹری جنرل جناب نثار عثمانی نے بھی اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ ہم شروع سے مذاکرات پر یقین رکھتے ہیں اور اس تجویز کی معقولیت ثابت کرنے کے لئے اس وقت بھی مذاکرات کے لئے تیار ہیں۔ حکومت کو چاہئیے کہ اتحاد کے سربراہ کی تجویز کے مطابق گرفتار کارکنوں کو رہا کر دے - برطرف ملازمین کو روزگار پر بحال کر کے، پی ایف یو جے اور اپنک کے رہنماؤں سے مذاکرات کرے۔ لیکن بدقسمتی سے حکومت میں مفاد پرستوں کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو یہ نہیں چاہتا کہ حکومت اور پی ایف یو جے، اپنک کے حقیقی رہنماؤں کے درمیان مذاکرات ہوں۔ اور افہام و تفہیم کی فضا میں مسائل حل ہوں۔ کیونکہ ایسا ہونے پر ان کی اپنی دوکانداری چوپٹ ہو جائے گی۔ لہذا اتحاد کی حکومت نے اتحاد کے سربراہ کی تجویز کو قبول کرنے کی بجائے ان کا گھیراؤ کر کے اور یہ کہہ کر

ڈاؤ میڈیکل کالج کے طالب علم اور این ایس ایف کے کارکن مسٹر آفتاب پوشنی جنہوں نے آزادی صحافت کی جدوجہد میں گرفتاری پیش کی۔

ان کا منہ بند کر دیا کہ اس معاملے میں بولنے والے آپ کون ہوتے ہیں۔ یہ امور مملکت ہیں، متعلقہ وزیر اطلاعات کی ذمہ داری ہے کہ وہ کس طرح اپنا کام انجام دیں، براہ کرم آپ درمیان میں نہ بولیں:۔

حیرت کی بات ہے کہ اتحاد کے سربراہ نے اس تجویز کو ایک بار نہیں کم وبیش تین بار دہرایا ہے۔ مگر وزیر اطلاعات نخسود اعظم فاروقی اور ان کے حواریوں کے سامنے وہ بے دست پا بن کرر ہ گئے ہیں۔ جماعتیوں کے مسئلہ پر اتحادیوں کے سربراہ اور اتحادی وزراء کے درمیان جو تنازعہ اور کشمکش سامنے آئی ہے اس سے نام نہاد سول حکومت کے اختیارات اور اس کے عزائم کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لمحۂ فکریہ ہے کہ مارشل لاء کی چھتری میں پناہ لینے والی حکومت جس کی نکیل جماعت اسلامی کے ہاتھوں میں ہے، دوسرے عوامی مسائل پر کس قسم کے رد عمل کا مظاہرہ کرے گی اور کیا عوام کے مسائل حل کرنے کا دعویٰ کرنے والی نام نہاد سول حکومت مسائل کی گرد تک بھی پہنچ سکی۔؟

نام نہاد سول حکومت میں شامل جماعت اسلامی کے وزراء نوکر شاہی اور صحافت کے داغدار چہرے جو کل تک آزادیٔ صحافت، آزادیٔ تحریر و تقریر کے بلند و بانگ دعوے کرتے تھے۔ آج کالے قوانین کو کسی نہ کسی شکل میں برقرار رکھتے ہوئے، صحافیوں، پریس کارکنوں اور مظلوم طبقات کی جائز منصفانہ اور پرامن تحریک کو ریاستی جبر و تشدد کے ذریعہ کچل دینے کی پالیسی پر گامزن ہیں۔ اچھا ہوا۔ جو انہیں اقتدار مل گیا۔ اقتدار کھرے کھوٹے کی پہچان کرا دیتا ہے۔ جماعت اور اس کے حلیفوں کے مذموم اور گھناؤنے عزائم کو بے نقاب کرنے میں چند ہفتوں کے اس اقتدار نے بڑا موثر کام دکھایا ہے۔

جہاں تک تحریک کا تعلق ہے تو یہ کامیابی سے جاری ہے۔ یہ درست ہے کہ عوام کے درمیان گرفتاریاں پیش کرنے کے باوجود انتشار اور ہنگامے برپا نہیں ہو پاتے۔ ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ اور یہی کہا تھا کہ عمل کے دوران ثابت کریں گے کہ ہماری ہر تحریک پرامن ہے۔ یہ بات صحافیوں، پریس کارکنوں اور ان کے ساتھی مزدوروں، کسان اور طلباء دو ماہ سے زائد کی تحریک کے دوران ثابت کر چکے ہیں اس کے ساتھ ہی یہ عزم صمیم بھی رکھتے ہیں کہ تشدد کے ذریعہ ہماری تحریک کو کچلا نہیں جا سکتا اور اگر تحریک، جاری رکھنے پر مجبور کیا گیا تو تحریک جاری رہے گی تا آنکہ ہمارا ایک بھی ساتھی کھلی فضا میں پرواز کی طاقت رکھتا ہے، عوامی جدوجہد کمیٹی زندہ باد،

اپنک، پی ایف یو جے زندہ باد

مزدور کسان طلباء اور پریس کارکن اتحاد زندہ باد

بقیہ:۔ حسین نقی

پاکستان کا قرض حسنہ اتار دیجیے! یا سب کچھ بھول گئے ہیں حضرات "مومنین"

یاد رکھیئے جب مشرقی پاکستان کو بوجھ سمجھ کر وہاں بسنے والوں کو بھیڑ بکری سمجھ کر وہاں کی عورتوں کو محض اپنی داشتاؤں کے لائق گردان کر کھل کھیلا گیا تو پھر بھی ادھر تو قیمت کا علاقہ تھا، قید و بند۔ بے عزتی کے بعد ہی سہی۔ اب جو ہو گا، ہو سکتا ہے مجھے لگتا ہے ہونے والا ہی ہے تو کہاں جائیں گے؟

آپ سمجھیں گے شاید میرے مخاطب یہی حضرات ہیں جن کا اوپر ذکر آیا ہے۔ ہرگز نہیں کہ وہ اگر سمجھنے ہوتے تو یہ سب کچھ نہ کر رہے ہوتے جو کر رہے ہیں۔

میرے مخاطب آپ، ہیں، بدل چل کر جو آپ کیسے ذہن اور فکر میں درست اور صحیح نظر آتا ہے برملا کہیں۔ بے خطر کہیں۔ اگر ہم ایک قوم ہیں تو ہم قوم پرست بھی ہیں۔ اور دنیا بھر میں قوم پرست ایسا کرتے ہیں۔

ہم عربوں کو، فلسطینیوں کو اور ایرانیوں کو کیا کچھ نہیں کہتے، سمجھتے رہے لیکن وہاں دہشت گردی کی انتہا کر دیئے جاتے

عوامی جدوجہد کمیٹی کے مطالبات

۱۔ مہنگائی اور بیروزگاری کی موثر روک تھام کی جائے۔ اور مہنگائی کے تناسب سے تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔

۲۔ تمام غیر معمولی (کالے) قوانین اور کوڑوں کی سزائیں منسوخ کی جائیں اور جمہوری آزادیاں بحال کی جائیں۔

۳۔ حق ہڑتال بحال کیا جائے۔ ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر سے پابندیاں ختم کی جائیں۔ چھانٹیاں اور تالابندیاں بند کیجائیں

۴۔ ہاریوں کی بیدخلیاں بند کی جائیں۔ انہیں نقصانات کے معاوضے ادا کئے جائیں۔

۵۔ تعلیمی اداروں میں سرکاری مداخلت بند کی جائے۔

۶۔ تمام گرفتار اخباری کارکنوں، مزدوروں، ہاریوں اور طلبہ کو غیر مشروط طور رہا کیا جائے۔

کے باوجود مشین گنوں سے لیسی ہیلی کاپٹروں کی گولیوں کی بارش کے باوجود غیرت مند، محب وطن ایرانی، بچوں، عورتوں مردوں نے کہا کہ ہم اپنے وطن کے وارث ہیں۔

یہاں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی، یہاں شہنشاہیت ختم ہوئے صدی گذر چکی ہے بلکہ صدیاں۔

اگر ہمارے محب وطن سیاسی کارکن، طلبہ، محنت کش، محب وطن عناصر سوچیں، سمجھیں، غور اور فکر کریں، اور چھوٹی چھوٹی سیاسی دوکانداریوں کے بجائے قوم پرستی کا حق ادا کرنے کا فیصلہ کریں تو جنرل ضیاء کو وہ آپریشن فیئر پلے کرانے پر مجبور کر دیا جا سکتا ہے جس کو وہ اٹھا کر طاق پر رکھ چکے ہیں۔

اقتدار کی ہوس میں تمام اصولوں کو پیروں تلے روند ڈالنے والی سیاسی جماعتوں کو جو حکومت میں شامل ہو چکی ہیں راہ راست پر لایا جا سکتا ہے۔

پاکستان کو، اپنے وطن کو بڑی طاقتوں کے طاقت کے کھیل کا میدان بننے سے بچایا جا سکتا ہے۔

دس، بیس، پچاس برس بڑے بڑے نعرے لگانے والے قبروں میں پیر لٹکائے ہوئے "لیڈروں" کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ مہلک بیماریوں کے نتیجہ میں میانی صاحب کے قبرستان کا رخ کرنے کے بجائے آگے بڑھو۔ اور پاکستان کو انتشار سے، مزید ٹکڑے پارچے ہونے سے بڑوں، بچوں، عورتوں کے خون خرابے سے بچاؤ، اور آگے آؤ۔

پاکستان اور پاکستانیوں کو دنیا بھر کی نظروں میں ذلیل ورسوا ہونے، بھیک منگے، دھوکہ باز، جعلساز، ایک دوسرے کے قاتل سمجھے جانے کے بجائے ایک باعزت ملک اور باحمیت شہری، نساق اور انسان دوست بناؤ۔ کیا یہ ہمارا، میرا آپ کا سب کا فرض نہیں۔ کیا یہ ہم سب پر پاکستان کا قرض نہیں۔ یا پاکستان کوئی ملک نہیں رہا، پاکستانی کوئی قوم نہیں رہے۔ اسلام تو ظلم کے خلاف، ظالم کے مقابلے میں "جہاد" کا درس دیتا ہے۔ میں تو صرف احتجاج کی بات کر رہا ہوں۔

یہ احتجاج میرا، آپ کا حق ہے بلکہ اب تو فرض ہے۔ جہاں بھی، جس طرح بھی ہو سکے۔ یہ ملک میرا اور آپ کا بھی اتنا ہی ہے جتنا کسی جرنیل کا۔ اور یہ اگر اسکندر مرزا، ایوب، یحییٰ اور بھٹو کی جاگیر نہیں تھا تو جنرل ضیاء کی بھی جاگیر نہیں ہے نہ چیندہ زرداروں کی۔ اس لئے فیئر پلے کرنے پر مجبور کرنا ہمارا فرض بھی ہے حق بھی اور پاکستان کا ہم پر قرض بھی۔

صحافیوں کے مطالبات تسلیم کئے جائیں

علی محمد میمن

سندھی ہاری کمیٹی کے مرکزی جوائنٹ سکریٹری علی محمد میمن نے کہا ہے کہ صحافیوں کی پرامن جدوجہد کو دو مہینے پورے ہو گئے ہیں لیکن حکومت نے اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہتے ہوئے ابھی تک کوئی مثبت قدم نہیں اٹھایا ہے حکومت کو جماعت اسلامی والوں نے یہ باور کرایا ہے کہ یہ جدوجہد صحافیوں کی نہیں بلکہ پیپلز پارٹی والوں کی ہے۔ اس لئے ان سے بات چیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حکومت شاید یہ بات بھول گئی ہے کہ ایوب کو بھی جماعت اسلامی کے مخبروں نے غلط رپورٹیں دی تھیں، یحییٰ کو بھی ان ہی لوگوں نے تخت چھوڑنے کی نوبت تک پہنچایا تھا بھٹو بھی ان جھوٹے مخبروں سے نہیں بچ سکے۔ اس لئے موجودہ صاحب اقتدار لوگوں کو بھی اصل مسئلے کو جڑ تک پہنچنے کے لئے حقیقت کی عینک سے دیکھنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ پانی پھر سر سے چڑھ جائے۔

صحافیوں کی جدوجہد اب صرف صحافیوں کی جدوجہد نہیں رہی ہے بلکہ اب جدوجہد ایک ملک گیر ہڑتال ہے جس میں کسان، طلبہ اور مزدور بھی شامل ہیں۔ ہمارے ملک میں ۹۵ فی صد آبادی کسانوں، طلبہ، مزدوروں اور دوسرے غریب عوام پر مشتمل ہے۔ اس لئے یہ واضح ہے کہ یہ جدوجہد ملک کے عوام کی جدوجہد ہے اور جب بھی ملک کے عوام یکمشت ہو کر کسی جدوجہد میں شرکت کرتے ہیں تو ضرور کامیاب ہوتے رہیں۔ ایسی عوامی جدوجہدیں اس سے پہلے بھی دو مرتبہ اسی ملک میں چلائی گئی ہیں اور کامیاب ہوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ جدوجہد بھی پہلے کی سی دو کی طرح تیسری ثابت ہو۔ اس لئے ضروری ہے کہ صحافیوں کے حقیقی نمائندوں سے بات چیت کی جائے، تمام اسیروں کو رہا کیا جائے اور نوکریوں سے نکالے ہوئے صحافیوں کو روزگار مہیا کیا جائے، ہاریوں کی بیدخلیاں بند کی جائیں۔

گرفتار شدہ صحافیوں ہاریوں طلبہ اور مزدوروں پر مبینہ تشدد کا ذکر کرتے ہوئے علی محمد میمن نے کہا کہ اپنے حقوق حاصل کرنے والوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ ہاں! البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ یہ کرسی آنی جانی چیز ہے۔ اس کرسی پر ہمیشہ کے لئے تختی جمائے رکھنا عقلمندی نہیں ہے۔ یہ کرسی کسی کو راس نہیں آئی۔ اس لئے اس کرسی کے زور پر تشدد کرنا دانائی نہیں ہے۔ سابق حکومت کے وزیر جیل کو جب اس حکومت نے جیل بھیجا تو وہ شکایت کرنے لگے کہ "جیل میں رضائی بھی نہیں رکھنے دیتے، یہاں تو بہت سردی ہے"۔ تو کسی نے کہا کہ "بھائی جیل کے ابھی تک تو وہی قانون ہیں جو آپ نے بنائے تھے۔ اس حکومت نے تو ابھی نئے قانون نہیں بنائے"۔ یہ سن کر سابق وزیر جیل کچھ جھینپ سے گئے۔ یہ الگ مثال ہے، ایسے کئی مثال دیئے جا سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ظلم و تشدد کئے جاؤ، ہم اپنا حق مانگتے رہیں گے۔ آپ نے سزائیں دی ہیں کوڑے لگائے ہیں، ننگا کر کے الٹا لٹکایا ہے، ایک ٹانگ پر پوری رات کھڑا کیا ہے، سات سات دنوں تک سونے نہیں دیا، بجلی کے شاک لگائے ہیں، لوہے کے شکنجوں میں جکڑ کر موسلادھار بارش میں لٹایا ہے، مار مار کھال ادھیڑ ڈالی ہے۔ لاٹھی چارج کیا ہے، آنسو گیس پھینکی ہے، گولی چلائی ہے، کیا کچھ نہیں کیا ہے آپ نے پرامن جدوجہد چلانے والوں کے ساتھ! اس لئے آپ کرتے رہیئے جو کچھ آپ کو کرنا ہے، ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ابھی تک صرف دو سو پچیس افراد گرفتار ہوئے ہیں۔ ہندوستان میں تو ایک دن میں بیس ہزار کسان گرفتار کر لئے گئے تھے۔ ہم یہ شکایت نہیں کریں گے کہ ہم پر تشدد کیوں ہو رہا ہے۔ یا ہمیں گرفتار کیوں کیا گیا۔

لیکن اس سے پہلے ایک اور طریقہ بھی ہے اور وہ ہے افہام و تفہیم کا۔ صحافی پہلے بھی واضح اعلان کر چکے ہیں کہ اگر ان کے حقیقی نمائندوں سے بات چیت کی گئی تو وہ بات چیت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اب یہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ بھی عقلمندی سے کام لے کر بات چیت کے ذریعے یہ مسئلہ حل کر سکتی ہے۔

صحافیوں کی تحریک سے حکومت کے ہرکارے انگشت بدنداں ہیں

اخباری کارکنوں پر تشدد انسانیت کے منہ پر طمانچہ ہے

ملتان ، قسور سعید مرزا

پاکستان پیپلز پارٹی ضلع ملتان کے صدر ملک الطاف علی کھوکھر، نائب صدر کنور احسان اللہ خان ایڈووکیٹ، جنرل سکریٹری نذر سجاد قریشی ایڈووکیٹ اسسٹنٹ سکریٹری ظفر علی تہیم ایڈووکیٹ، پروگریسو ورکرز آرگنائزیشن کے سکریٹری جنرل قسور جوزف کاشانی، سابق ممبر صوبائی اسمبلی احمد بخش تہیم، شیخ محمد صدیق، مزدور رہنما خورشید احمد خان، ینگ لائرز ایسوسی ایشن ملتان کے کنوینر

ملک محمد نسیم، پیپلز لائرز ایسوسی ایشن ملتان کے صدر ظفر علی خان نگسی ایڈووکیٹ، طالب علم رہنما صفدر عباس اور محمد اسلم وڑائچ نے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ آزادی، صحافت کی بحالی کی تاریخ ساز جد و جہد اور آٹھ نکاتی جد و جہد کی تکمیل کے لئے صحافیوں کی تحریک آج بھی اسی جوش و خروش اور جذبہ سے جاری ہے۔ جس پر، حکومت وقت کے ہرکارے انگشت بدنداں ہیں۔ اور یہ جد و جہد اب صرف صحافیوں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں طلبہ، مزدور، کسان بھی شانہ بشانہ چل رہے ہیں بیان میں کہا گیا ہے کہ ملک کے ممتاز صحافیوں ۔، اخباری کارکنوں پر تھانوں میں تشدد انسانیت اور، شرافت کے منہ پر ایک طمانچہ ہے حکمران طبقہ طاقت کے نشہ میں اندھا ہو چکا ہے بیان میں کہا گیا ہے کہ صحافیوں کی تحریک و جد و جہد ملک کے تمام مظلوم طبقات کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور ملک کے مظلوم طبقات اس سیاہ رات سے چھٹکارہ حاصل کرنے میں صحافیوں کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ بیان میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ تمام سزا پانے والے صحافیوں کو غیر مشروط طور پر فی الفور رہا کیا جائے۔

پیپلز لائرز ایسوسی ایشن ملتان اور پروگریسو ورکرز آرگنائزیشن کے کارکنوں کا ایک مشترکہ اجلاس بھی ملتان میں منعقد ہوا اجلاس سے ظفر علی تہیم ایڈووکیٹ قسور سعید مرزا، محمد اسلم لون نے خطاب کیا۔ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ موجودہ حکومت، ہٹ دھرمی سے کام نہ لے، صحافیوں کے مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں فی الفور رہا کیا جائے۔ ■

پریس کانفرنس میں دیتے گئے بیان کی کاپی دیدو

ٹنڈو الہیار ، کامل سمون

۱۱ ستمبر کی شام کو مقامی پولیس نے اپنی حماقت کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے مقامی پریس کلب کو مکمل گھیرے میں لے لیا۔ سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس والے پریس کلب کے چاروں طرف ٹولیوں کی شکل میں جمع ہو گئے تھے جب مقامی صحافی شام کے وقت پریس کلب کی طرف آنے لگے تو انہیں پولیس کے اس رویے پر بڑی حیرت ہوئی بہر حال وہ خاموشی کے ساتھ پریس کلب کے لان میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف رہے اس شام کو چھ بجے کے قریب قومی اتحاد کے مقامی صدر جناب

باقی ص۴۲ پر

حزب اقتدار اور حزب اختلاف کا مصنوعی ڈھانچہ تشکیل پا چکا ہے

ہم توجہ دلاتے ہیں کہ استاد میکیاولی نے حکومت کرنے کے جو گُر سکھائے تھے ان سے بھرپور طریقے پر استفادہ نہیں کیا جا رہا ہے۔ اپنی طاقت اور عوام کی اکثریت کی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بادشاہ دائیں بائیں اور آگے پیچھے دیکھے بغیر چل رہا ہے، کیونکہ پیچھے دیکھنا تباہی کو دعوت دینا ہے۔ آگے دیکھنا خواہ مخواہ کے وسوسوں کو دل میں جگہ دینا اور دائیں بائیں دیکھنا اس کے نزدیک وقت ضائع کرنا ہے۔

یہاں ہم یاد دلائیں کہ ایوب خان نے چاروں سمتوں پر نظر رکھ کر اپنے قدم جمائے تھے۔ یحییٰ خان نے دائیں بائیں دیکھا ضرور تھا لیکن آگے اور پیچھے دیکھنے کی ضرورت سے بے نیاز تھا۔ بھٹو صاحب نے بھی، جو عوام کا منتخب نمائندہ تھا، چاروں سمتوں پر نظر رکھی تھی، لیکن ڈالر کی کرامت سے اپنے قدموں کے نیچے سے ہر لمحہ سرکتی ہوئی زمین کی طرف توجہ نہیں دی

ویسے اس وقت جو سیاسی صورتِ حال ہے، اس کے مطابق تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بساطِ سیاست کا ہر مہرہ بادشاہ کی مرضی کا تابع ہے۔ خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے۔ سیاست کا یہی ایک رخ ہے جس سے میکیاولی کا رنگ جھلکتا ہے، ورنہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے، بادشاہ میکیاولی کے اصولوں کو نظر انداز کر کے اپنے ہی تجربے کرنا چاہتا ہے۔ ان تجربوں کا نتیجہ کیا نکلے گا، یہ تو میکیاولی نے بتا دیا ہے، لیکن ہم بتانے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

اس تمہید کے بعد اب آیئے موجودہ سیاست کی بساط کی طرف۔ قومی اتحاد کی چار جماعتوں کو جو حکومت میں شامل ہو گئی ہیں، قابو میں رکھنے کے لئے تحریک استقلال، جمعیت علمائے پاکستان اور این ڈی پی کو حزب اختلاف کی نشستیں الاٹ کی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر قومی اتحاد کی موجودہ اور سابق جماعتوں یعنی مسلم لیگ، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے اسلام، پاکستان جمہوری پارٹی، خاکسار تحریک، نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی، تحریک استقلال اور جمعیت علمائے پاکستان کو عوام کے اصل مسائل اچھالنے یا ان مسائل کی بنیاد پر عوام کو ان کے گرد جمع ہونے سے روکنے کے لئے پاکستان پیپلز پارٹی کا دیوہیکل ہیولیٰ دکھا کر ڈرایا جاتا ہے۔ ادھر پیپلز پارٹی کو مؤثر حزبِ اختلاف کی حیثیت سے ابھرنے سے روکنے کے لئے قومی اتحاد میں پھوٹ ڈال کر مصنوعی حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف بھی نامزد کر دی گئی ہے کہ اس طرح سیاسی خلا بھی نہ پیدا ہو گا اور اس خلا کو پُر کرنے کے لئے کوئی ایک جماعت حزبِ اختلاف کی واحد ترجمان بن کر بھی سامنے نہ آ سکے گی۔

جب دیکھا گیا کہ پیپلز پارٹی کا توڑ مشکل ہو رہا ہے تو ایک مُہرہ کوثر نیازی گروپ کے نام سے آگے بڑھایا گیا۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کا زیادہ غلغلہ بلند ہوا اور پنجابیوں نے بھٹو کی مخالفت کرنے سے انکار کیا تو دیکھا گیا کہ وہ اخبارات بھی جو بزنجو صاحب اور عطاء اللہ مینگل کے بیانات نظر انداز کیا کرتے تھے، اب ان کے بیانات کو صفحۂ اول پر شہ سرخیوں کی زینت بنانے لگے۔ سرحد میں ولی خان کے رویے میں تبدیلی آنے لگی تو قیوم لیگ کو پگارا لیگ میں ضم کرا دیا۔ سندھ میں سندھیوں نے بھٹو کا ساتھ چھوڑنے سے انکار کیا تو کراچی، حیدر آباد اور سکھر کو کرم نوازی کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ مہاجروں پر نوازشات کا تبرک برسنے لگا، اور کچھ یہ تاثر دیا جانے لگا کہ حکومت سرحد کے پٹھانوں کے ساتھ مہاجرین کی ہی ہے۔ اب اگر آٹھ دس لاکھ بلوچ اور اتنے ہی سندھی مخالفت کرتے ہیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔

بہر حال ذکر تھا مہروں کا۔ شطرنج کی طرح سیاست کی بساط پر بھی ایک چال کے جواب میں دوسری چال چلی جاتی ہے جس میں ہر دو فریقوں کے پیادے پٹتے ہیں، وزیروں کی بھی باری آتی ہے

قبل بھی نہیں بچتے اور بالآخر صدر کو بھی جانا پڑتا ہے یہ کھیلنے والوں پر منحصر ہے کہ وہ اپنی چال کے معاملے میں کتنے محتاط ہوتے ہیں سیاست کی بساط میں نعرے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ چونکہ ہر جانے والی حکومت بری ہوتی ہے۔ اس لئے آنے والے اپنے آپ کو نئے نعروں سے لیس کرتے ہیں، ایک نعرہ فرسودہ یا ناقابل عمل نظر نہیں آتا تو کمال ہوشیاری کے ساتھ اس نعرے کی تکرار کم کر دی جاتی ہے تاکہ عوام جن کا حافظہ روایتی طور پر کمزور ہوتا ہے، اس تبدیل شدہ موقف سے ذہنی طور پر ہم آہنگ ہونے کے لئے تیار رہیں۔

بادشاہ کہتا ہے کہ سیاست میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سیاست ہی ہے کہ جس کی وجہ سے اسلام لانے اور نظام مصطفیٰ نافذ کرنے کی باتیں کی گئیں۔ احتیاط کے طور پر ایک اقتصادی بہلاوا یہ بھی دیا گیا کہ اگر ہم برسر اقتدار آ گئے تو ۱۹۷۰ء کی قیمتیں نافذ کر دیں گے اور صحیح معنوں میں عوام کے جمہوری حقوق بحال کریں گے۔ قول اور فعل کا یہ فرق اچھے مکیاولی کی نشاندہی نہیں کرتا۔

اب ہم اس بنیادی تضاد کی طرف آتے ہیں بادشاہ کا کہنا ہے کہ سیاست میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی۔ جب ہم بادشاہ کا یہ فرمان مانتے ہیں تو اس کے ساتھ ہمارا یہ بھی ایمان ہے کہ دین میں ہر بات حتمی ہوتی ہے۔ یہاں دین سے مراد کوئی اور دین نہیں ہے کیونکہ ہم یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ دوسرے مذاہب میں (بشمول عیسائیت) وقت کی ضرورت کے اعتبار سے تحریف کی گئی ہے۔ چنانچہ اس ایقان کے ساتھ کہ ہمارا دین ہر لحاظ سے مکمل ہے، ہم بادشاہ کا یہ فرمان کس طرح تسلیم کر لیں کہ سیاست میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی؟ اگر سیاست کو دنیاوی معنوں میں لیا جائے، تو حقیقتاً اس میں کوئی بات حتمی نہیں ہوتی لیکن گھپلا اسی وقت ہوتا ہے جب دین اور دنیا کے معاملات کو باہم خلط ملط کر دیا جائے۔ اس گھپلے کے نتیجے میں وقتی فوائد تو ضرور حاصل ہوتے ہیں اور کون سے گھپلے میں وقتی فوائد حاصل نہیں ہوتے؟ لیکن بالآخر ہوتا یہ ہے کہ یہ تضادات آہستہ آہستہ کچھ اس طرح کھل کر سامنے آ جاتے ہیں کہ بادشاہ حتمی طور پر نہ دین کا رہتا ہے اور نہ دنیا کا۔ کیونکہ دنیاوی معاملات میں تو پینترے بدلے جا سکتے ہیں لیکن یہ کہنا کہ دین

کیا سنی مسلمانوں کے ذہنوں کے سوالات کا جواب بادشاہ اور صالح وزیر سے سکیں گے دے

کہ نفاذ بتدریج اور آہستہ آہستہ ہو گا، کیا معنی رکھتا ہے؟ پھر ایک مرد مومن کی حیثیت سے جب ایک نیا بادشاہ تخت پر بیٹھتا ہے اور چند وعدوں کے بعد سیاست کرتا ہے جو حتمی نہیں ہوتی تو ایسا بادشاہ جن انقابات سے نوازا جاتا ہے، انہیں کوئی بھی دیندار آدمی پسند نہیں کرے گا۔

عیسائیوں کی بات چھوڑیئے، انہوں نے پاپائیت نافذ کرنے کے جو ناکام تجربے کئے ان پر مٹی ڈالیئے۔ کمیونسٹ ممالک کی طرف بھی نہ دیکھئے وہ تو کافر اور دہریئے ہیں۔ پڑوس میں ہندوستان پر بھی دو حرف بھیجئے کہ وہ بتوں کو پوجتے ہیں، ان سے خیر کی کیا توقع؟

۱: مسلمانوں کو مسلمانوں سے اور بھائی کو بھائی سے لڑانا۔

۲: غریبوں، مسکینوں، ناداروں اور نہتے افراد پر ظلم و ستم روا رکھنا۔

۳: اپنے مسلک کے برعکس مصلحتاً کوئی سیاسی قدم اٹھانا، مثلاً مزاروں پر جانا اور فاتحہ پڑھنا وغیرہ۔

۴: بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی کو ترجیح دینا۔

۵: خود عیش و عشرت میں رہنا اور قوم کی گاڑھے پسینے کی کمائی اپنے اوپر خرچ کرنا۔

۶: لڑائی کے وقت پیٹھ دکھا دینا۔

۷: باہمی میں کوئی موقف اختیار کر کے اس سے پھر جانا اور تاویلات پیش کرنا۔

۸: اقربا پروری اور اقربا نوازی کرنا۔

۹: تہمت لگانا، جواب دینے کا حق چھین کر الزامات عائد کرنا یہ تمام باتیں ایسی ہیں کہ دنیاوی سیاست میں تو قابل گرفت نہیں لیکن جب یہی کام دین کا سہارا لے کر کئے جائیں تو پھر اسے 'گھپلا' کہتے ہیں قرآن حکیم میں ایسے لوگوں کو جگہ جگہ ایک نام سے یاد کیا گیا ہے جو اس قسم کے گھپلوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ مگر پھر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ لوگ دین لانے کی بات کرتے ہیں تو گویا یہ طے کر چکے ہوتے ہیں کہ دین کی درآمد اور مشینری کی طرح اس کی تنصیب کا پرمٹ انہوں نے حاصل کر لیا ہے اور یہ بھی کہ جس علاقے میں اس کی تنصیب ہو گی یا نفاذ ہو گا وہاں جماعت اسلامی کی اصطلاح میں نسلی مسلمانوں یا مکتر مسلمانوں کی اکثریت رہتی ہے جنہیں CONVERT کرنا ضروری ہو گا۔ لیکن یہ معاملہ بھی ٹیڑھا ہے کیونکہ جب بقول شخصے 'شدھی' کا پورا عمل شروع کیا جائے گا تو ان 'نسلی مسلمانوں' کے ذہنوں میں چند بنیادی سوالات پیدا ہوں گے۔ جن کے تسلی بخش جواب بادشاہ اور اس کے صالح وزیر نہ دے سکے تب کیا ہو گا؟

شاید اسی لئے این ڈی پی کے خان عبدالولی خان اور جمعیت علمائے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں کہ "اسلام ۲۴ گھنٹے میں نافذ کیا جا سکتا ہے"

ہماری بھی حجامت ہونے لگی 'اسلام سلمانی'

یقین کیجئے کہ کارخانوں، فیکٹریوں اور ملوں میں تیار ہونے والی ہر قسم کی اشیاء اور تمام مصنوعات کی طرح ملک کے ممتاز ترین ہیئر ڈریسنگ اداروں اور بیوٹی سیلونوں میں انجام دی جانے والی ہیئر کٹ، شیو، شیمپو، مالش (مساج)، ہیئر کلر (خضاب)، ہاتھ و پاؤں کے ناخن بنانے، بال سنوارنے اور میک اپ وغیرہ کی خدمات پر بھی ایکسائز ڈیوٹی نافذ ہو گئی ہے

یہ انکشاف کرتے ہوئے پاکستان نیشنل ہیئر ڈریسرز فیڈریشن کے سیکریٹری جنرل مسٹر اسلام سلمانی نے بتایا کہ کراچی، لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں واقع انٹرکانٹی نینٹل ہوٹلوں کی باربر دکانیں اور بیوٹی سیلونیں تمام گاہکوں سے اپنی مہنگی ترین اجرتوں (سروس چارجز) اور بہترین ٹپ (بخشش) کے علاوہ پندرہ فی صد "سرکاری ٹیکس" بھی لے رہی ہیں۔ باربر رہنما مسٹر اسلام سلمانی نے مزید کہا کہ ایک سرسری اندازے کے مطابق ان ہیئر ڈریسنگ سیلونوں اور بیوٹی پارلروں میں ایکسائز ڈیوٹی کے طور پر گاہکوں سے اب تک ہزاروں روپے وصول کئے جا چکے ہیں۔

سیکھنا ہو تو چین سے سیکھو

پیکنگ کے ہوائی اڈے پر تلاشیاں نہ حفاظتی معائنے

حسن زردیزی

پاکستان میں سال بھر سے سُن رہے تھے کہ چین سے سیکھیئے۔ چاہے مسئلہ پیداوار بڑھانے کا تھا یا صفائی و صحت کا، ملک کے بڑے بڑے رہنما، سرکاری اداروں کے سربراہ یہاں تک کہ امریکی مشیر بھی یہ کہتے سنے گئے کہ "صاحب جیسے چین نے یہ مسئلہ حل کیا ہے اس کا جواب نہیں"۔ یہ سب کچھ سُن سُن کر ہمیں بھی شوق چرایا کہ جا کر دیکھا جائے کہ یہ چینی کس قسم کے لوگ ہیں جو اتنے بڑے بڑے مسائل جن کا ہم صدیوں سے شکار ہیں دیکھتے دیکھتے ہی حل کر لیتے ہیں۔ آخر ان کے پاس کون سا نسخۂ کیمیا ہے جس سے دنیا کے بہت سے پسماندہ ملک محروم ہیں۔

ہمیں اسلام آباد سے کینیڈا واپس جانا تھا۔ گو کہ بحرالکاہل کے راستے سفر کے اخراجات زیادہ تھے لیکن کچھ دن چین دیکھنے کا یہ نادر موقع تھا۔ چنانچہ ہم نے ویزا کے لئے درخواست دے دی۔ چینیوں کے طریق کار سے تھوڑا سا تعارف تو اسلام آباد ہی میں ہو گیا۔ یہاں غیر ملکی سفارت خانوں پر پولیس کی بڑی بڑی گارڈیں متعین ہوتی ہیں۔ جب ہم چین کے سفارت خانے کی نئی عمارت میں پہنچے تو ہمیں نہ کوئی سپاہی نظر آیا نہ کوئی چوکیدار۔ گیٹ کے اندر ایک استقبالیہ کمرہ تھا جس میں ایک چینی صاحب ٹیلیفون کے پاس بیٹھے تھے۔ ابھی ہم انہیں اپنی آمد کا مقصد سمجھا ہی رہے تھے کہ وہ خاتون جن سے پیشتر ٹیلیفون پر وقت ملاقات طے ہو چکا تھا بذاتِ خود آن پہنچیں اور ہمیں اندر لے گئیں۔ یہاں ٹھنڈی مشروبات سے ہماری تواضع کی گئی اور اس خاتون نے بتایا کہ چین میں ابھی سیر و سیاحت بہت محدود پیمانے پر ہے۔ نجی طور پر سفر کرنے والے سب سیاحوں کے لئے ویزا کی اجازت پیکنگ میں قائم چائنا انٹرنیشنل ٹریول سروس سے آتی ہے اور آج کل دنیا بھر سے لوگ چین کی سیاحت کے لئے کوشش میں ہیں۔ ٹریول سروس کی سب سہولتیں مہینوں پہلے بُک ہو چکی ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے یقین دلایا کہ ہمارے مخصوص حالات اور شوقِ سیاحتِ چین کے پیشِ نظر وہ بذریعہ تار پیکنگ سے اجازت حاصل کرنے کی کوشش کریں گی۔ یہ وعدہ لے کر ہم واپس لوٹے اور انتظار کی گھڑیاں گزارنے لگے۔ آخر کار جہاز کی روانگی سے تین روز پہلے پیکنگ سے اجازت نامہ آ گیا۔

اتوار کے روز صبح سویرے ملے جلے جذبات کے ساتھ ہمارا تمام کُنبہ پی آئی اے کے طیارے میں سوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں ہم ہمالیہ کی چوٹیوں کے اوپر پرواز کرتے ہوئے پیکنگ کی سمت رواں تھے۔ جہاز میں اکثر مسافر یورپ کی سیاح ٹولیوں پر مشتمل تھے اور ہر قسم کے کیمروں اور ریکارڈروں سے لیس تھے۔ مقامی وقت کے مطابق ہم تقریباً چار بجے پیکنگ کے ہوائی اڈہ پر پہنچے۔ یہاں پہنچ کر ہوائی سفر کا پرانا زمانہ یاد آ گیا۔ یہ شاید دنیا کے چند محدود ہوائی اڈوں میں سے ایک ہو گا جہاں نہ مسافروں کی تلاشیاں لی جاتی ہیں۔ نہ حفاظتی معائنے کے دوران سے گزرنا پڑتا ہے اور نہ ہی بندوقیں اٹھائے سیکورٹی پولیس والے نظر آتے ہیں۔ منٹوں میں ہم صحت، شہریت اور محصول کے دروازوں سے گزر کر سامان کی اصولی کے کمروں میں پہنچ گئے۔ یہاں ایک نازک اندام چینی صاحب ٹریول سروس کی طرف سے ہمیں لینے کے لئے موجود تھے۔ انہوں نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا اور تھوڑے تذبذب کے بعد پوچھا کہ کیا واقعی ہم ساتوں ایک ہی کنبے کے افراد ہیں؟ تھوڑی دیر بعد جب ہمارا سامان نکلنا شروع ہوا تو انہیں اور بھی تعجب ہوا۔ بولے یہ سب آپ کا سامان ہے! پھر بولے خیر کوئی بات نہیں انتظام کرتے ہیں۔ کچھ سامان انہوں نے اٹھایا کچھ ہم نے اور ہوائی اڈے کے باہر آ گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب ایک ٹیکسی لے کر آئے ہوئے تھے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ پیکنگ کی ٹیکسیوں کے چھت کے کیریر نہیں ہوتے۔ سمٹ سمٹا کر ہم دو ٹیکسیوں میں سوار ہو کر شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ ہوائی اڈے سے شہر کی حدود تک تقریباً ۲۰ میل کا فاصلہ ہے۔ کھلی سڑک کے دونوں طرف بڑے بڑے درختوں کے ذخیرے تھے۔ ان کے پیچھے سرسبز کھیت۔ سڑک پر ٹریفک بہت کم تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر صاف ستھری مسافر بسیں نظر آتی تھیں یا اِکا دُکا موٹر کاریں۔ کبھی کبھی سڑک کے کنارے باربردار گھوڑا گاڑیاں بھی نظر آئیں۔ شہر پہنچ کر ہمیں سب سے بڑے "پیکنگ ہوٹل" میں اتارا گیا۔ ہمارے چینی ترجمان نے بتایا کہ یہاں ہمارے لئے جس رہائش گاہ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ وہ ناکافی ہو گی۔ آپ ہوٹل کے لابی ہال میں آرام کریں۔ منہ ہاتھ دھوئیں۔ ریستوران میں کھائیں پیئیں اور میں آپ کے لئے ایک دوسرے ہوٹل میں مناسب رہائش کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس ہوٹل میں ہم نے منہ ہاتھ دھویا۔ بچوں نے اچھل کود کی ریستوران میں کچھ کھایا پیا اور ابھی ایک لاؤنج میں بیٹھے ہی تھے کہ وہ نازک اندام چینی صاحب پھر آ گئے۔ اس دفعہ وہ ہمیں "چی ین می ین ہوٹل" لے گئے اور ہمیں چھٹی منزل کے تین کشادہ کمروں میں پہنچا دیا گیا۔ ہمارے ترجمان یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ ہوٹل کا عملہ پیکنگ میں گھومنے پھرنے کے لئے ٹیکسی کا انتظام کر دے گا۔

ہمارے پاس چین میں رہنے کا دس دن کا ویزا تھا اور پیکنگ سے آگے سفر کے لئے کوئی نشستیں بک نہیں تھیں۔ چنانچہ دوسرے دن ناشتہ کرنے کے بعد ہم سب سے پہلے کینیڈا کے لئے جہاز میں پیشگی نشستیں بک کرانے نکلے۔ پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ چین میں انگریزی یا کوئی اور بیرونی زبان خال خال ہی بولی یا سمجھی جاتی ہے۔ ہمارا ہوٹل یورپ، شمالی امریکہ اور مشرقی ایشیا کے لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ہوٹل کے بڑے ہال میں سیاحوں کی ضروریات کا سب سامان موجود تھا۔ بنک، ڈاک خانہ، ضروری اشیا اور مصنوعات کی دوکانیں وغیرہ لیکن ان سب سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے یا تو چینی زبانوں میں گفتگو کریں یا ٹوٹے پھوٹے جملوں

جب پپا ہمیں پیدا انگریز یہ ہم خالد بھی لے جاتا ہے

اور اشاروں سے۔ اپنا مطلب نکالیں۔ بہرحال چینی کارندوں کے ہشاش بشاش چہروں اور تحمل کے پیشِ نظر سب کام بغیر دقت کے نکل جاتا تھا۔

چین سے باہر جانے والی سب پروازوں پر چائنا ایئرلائن خود نشستیں بُک کرتی ہے۔ اس ایئرلائن کے دفتر جانے کے لئے تِن مِن اسکوائر سے گذر کر جانا تھا۔ اس چوک سے رومانیہ کے صدر چاؤسسکو جو اس وقت چین کے دورے پر آئے ہوئے تھے گزرنے والے تھے۔ ٹیکسی والے نے اپنی زبان، انگریزی کے کچھ الفاظ اور اشاروں کو جوڑ جاڑ کر بتایا کہ ہمیں ہوٹل سے نکلنے کے لئے کچھ تاخیر ہوگی کیوں کہ صدر چاؤسسکو کے استقبال کے لئے تِن مِن اسکوائر بند ہے۔ ہم نے سوچا معلوم نہیں کتنی لمبی انتظار ہوگی اور واپس ہوٹل کے لاؤنج میں جا بیٹھے۔ تقریباً ۱۰ منٹ گزرے تھے کہ ٹیکسی والا ہمیں لینے کے لئے آگیا اور کہا کہ اس کی اطلاع کے مطابق صدر چاؤسسکو کی سواری چوک سے گذر چکی ہے اس لئے ہم روانہ ہو سکتے ہیں۔ جب ہم ہوٹل سے روانہ ہوئے تو معلوم ہوا کہ تِن مِن اسکوائر کیوں موٹر گاڑیاں کے گذرنے کے لئے وقتی طور پر بند تھا۔ اس چوک کی طرف جانے والی سڑکوں پر سے ہزاروں لوگ قطار اندر قطار رواں دواں تھے۔ ان میں سکولوں کے لڑکے اور لڑکیاں سرخ، سفید اور سنہری کپڑوں میں ملبوس ہاتھوں میں ریشم کے گلدستے لئے جا رہے تھے۔ کام کاج کرنے والے لوگ نیلے یا سلیٹی رنگ کے لباس میں جوق در جوق چلے جا رہے تھے اور چوک کے قریب عوامی فوج آزادی کے دستے بینڈ باجوں پر لوگوں کے لئے کچھ آخری نغمے بجا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ لوگوں کا یہ سیلاب اپنے مخصوص مہمان کا روایتی طریقے سے استقبال کرنے کے لئے چلا ہوا تھا۔ قدرے حیرت انگیز بات ہمارے لئے یہ تھی کہ اتنے ہزاروں لوگ کس نظم و ضبط کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں۔ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور پھر ذرائع آمد و رفت کے لئے بغیر کوئی الجھن پیدا کئے منتشر ہو جاتے ہیں۔ ہماری ٹیکسی ہارن بجاتی ہوئی پیدل یا سائیکل سوار ہجوم میں سے فراٹے سے گذر گئی۔ سڑکوں اور چوراہوں پر کوئی کڈیا کسی قسم کے اور پولیس نظر نہیں آئے۔ تِن مِن اسکوائر کی اہمیت کا تھوڑا ذکر ہم بعد میں سنائیں گے۔ مگر اس دن یہاں سے گزرتے ہوئے ہمیں بچپن میں سنی ہوئی ایک بات یاد آگئی۔ پنجاب کے اضلاع میں مشہور تھا کہ لاہور اتنا بڑا شہر ہے کہ وہاں جتنے بھی لوگ چلے جائیں وہ کہتا ہے "لا" "ہور"۔ تیانمین چوک پر یہ بات اب بھی صادق آتی دکھائی دیتی تھی۔ چائنا ایئر سروس والوں نے ہمارے ٹکٹ اور دوسرے کاغذات دیکھے۔ چین سے جاپان اور جاپان سے کینیڈا کی پروازوں کے گوشوارے بھی دیکھے۔ پھر بولے کہ جب آپ کی نشستیں بُک ہو جائیں گی تو آپ کو اطلاع دیں گے۔ اس دفتر کے سامنے چائنہ ٹریول سروس کا دفتر تھا۔ ہم نے سوچا وہاں جا کر پیکنگ کی سیر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی جائیں۔ ان لوگوں نے ہمیں کچھ قابلِ دید جگہوں کے پتے بتائے جو ہم نے ایک کاغذ پر چینی زبان میں لکھوا لئے اس کے علاوہ ہم نے چھوٹے بچوں کا اسکول "کنڈرگارٹن ہائی سکول" تاریخِ چین کا عجائب گھر، پیکنگ آرٹ گیلری وغیرہ دیکھنے میں دلچسپی ظاہر کی جس کے لئے انہوں نے ایک ترجمان ہمارے ساتھ بھیجنے کا وعدہ کیا۔

دوپہر کے وقت ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ ہوٹل کے کشادہ ریستوران میں اب ہمارے لئے کھانے کی ایک میز مخصوص ہو چکی تھی۔ ریستوران میں داخل ہوتے ہی ایک یا دو میزبان خواتین ویٹرس ہمارے استقبال کو آجاتی تھیں۔ ہنسی خوشی کھانا لگاتیں اور چینی زبان میں بچوں سے یکطرفہ باتیں کرتی چلی جاتی تھیں۔ دو سالہ جعفر ان کے التفات کا خاص مرکز تھا۔ جب وہ اس کی خاطر کرنے میں مصروف نہیں ہوتیں تو میز کے پاس کھڑی یا آتے جاتے اس کے متعلق ایک دوسرے سے باتیں کرتی چلی جاتی تھیں۔ ہم سوچتے تھے کہ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر ہمیں بھی پتہ چلتا کہ آخر یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ بعد میں ایک دن میں نے بیگم سے کہا کہ اگر صوتی تاثرات سے کچھ اخذ ہو سکتا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ پنجابی زبان کے مطابق ننھے جعفر کے بارے میں کہتی ہیں۔ ہائے۔ ممی ممی کیندا اے، تے ساڈے کول نئیں آؤندا"۔

کھانے کے بعد ہم نے ٹیکسی لی اور پیکنگ کی سیر کو نکلے۔ یہ شہر صدیوں سے چین کا دارالحکومت رہا ہے۔ مختلف ادوار میں چین کے محنت کشوں نے اس شہر اور گرد و نواح میں فنِ تعمیر اور باغبانی کے کئی شاہکار پیدا کئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے تاریخی مقامات شہنشاہیت کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ عمارتیں اور باغات اب بھی پوری سجاوٹ کے ساتھ لوگوں کی سیر و تفریح کے لئے کھلے رہتے ہیں۔ پہلے ہم ان کے سے ایک مقام آسمانی مندر ٹیمپل آف ہیون گئے۔ یہ ایک بہت بڑا دلکش باغ ہے۔ اس کی مختلف سطحوں پر چھوٹی اور بڑی پگوڈا طرز کی عمارتیں سرخ اور سنہری رنگوں میں سجی ہوئی اٹھنے بیٹھنے کے لئے بنی ہوئی تھی۔ اس سیرگاہ کے علاوہ پیکنگ میں اور بھی کئی ایسے مقامات ہیں۔ مثلاً شہر ممنوعہ فاربڈن سٹی چینی شہنشاہوں نے خاص اپنی رہائش اور تفریح کے لئے ایک وسیع چار دیواری کے اندر بنایا ہوا تھا۔ عوام کو اس شہر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ موسم گرما کا محل اور پی ہائی پارک بھی چند اور سیرگاہیں ہیں جو اب عوام کی تفریح کے لئے کھلی رہتی ہیں۔ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں مسلسل ان باغات اور عمارات میں آتی جاتی ہیں۔ مگر جتنے بھی لوگ ان جگہوں میں بھر جائیں ان کی نقل و حرکت کا انداز کچھ ایسا ہے کہ ذرہ بھی بھیڑ یا گھٹن کا احساس نہیں ہوتا بس دھیمی دھیمی باتیں کرتے ہوئے لوگوں کے ہنستے مسکراتے چہرے بڑی صفائی سے ہمارا راستہ چھوڑ کر گزر جاتے تھے۔ البتہ ننھا جعفر اپنی ولایتی بچہ گاڑی میں سوار کبھی کبھی پاس سے گزرنے والوں کیلئے چھوٹی موٹی رکاوٹ پیدا کر دیتا تھا۔ معلوم ہوا کہ چینیوں کو ویسے بھی بچوں سے محبت ہے لیکن یہ ایک مختلف خدوخال کا غیر ملکی بچہ ان کیلئے خاص طور پر انوکھا تھا۔ چنانچہ ننھا جعفر جب بھی اپنی طرف متوجہ لوگوں کو اپنی جوابی حرکتوں سے محظوظ کرتا تو ایک جمگھٹا ہمارے گرد اکٹھا ہو جاتا تھا۔ پھر چاہے آپکو چینی آتی ہو یا نہیں وہ لوگ خوب ہنس ہنس کر اپنے تاثرات کا اظہار کرتے جاتے تھے۔ ان کے لئے شاید جعفر کی المونیم اور مصنوعی چمڑے کی بنی ہوئی ولایتی بچہ گاڑی بھی ایک عجوبہ تھی۔ جس پر ہم نے کوئی پانچ سو روپے خرچ کئے ہوئے تھے۔ ہمارے لئے ان کی اپنی بانس اور بید کی بنی ہوئی ہلکی پھلکی بچہ گاڑی قابلِ غور تھیں جن کی قیمت کوئی دس روپے کے لگ بھگ تھی اور سب چینی بچوں کے لئے یکساں استعمال میں نظر آتی تھیں۔

(باقی آئندہ)

جرم یہ ٹھہرا کہ

روزگار کا تحفظ مانگا گیا چھانٹیوں کی مخالفت کی

ملک اربوں کا مقروض ہے تو اسے کس کے حوالے کرو گے ، بشیر ظفر

بشیر ظفر لاہور کے ہردلعزیز مزدور رہنما ہیں۔ وہ متحدہ مزدور مجلس عمل لاہور کے سینیئر نائب صدر اور "عبدالرحمٰن شہید مزدور مرکز کوٹ لکھپت" کے صدر ہیں۔ گذشتہ ساڑھے تین ماہ سے وہ لاہور کی کیمپ جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ ان پر مارشل لاء کے ضابطہ ۱۳، اور ۳۳ کے تحت چار الگ الگ مقدمات بنائے گئے ہیں۔ کوٹ لکھپت کے عظیم مزدور رہنما عبدالرحمٰن شہید کی شہادت کے بعد بشیر ظفر ہی وہ مزدور رہنما ہیں جنہوں نے عبدالرحمٰن شہید کی جدوجہد کی راہ اپنائی اور شہید رہنما کی یاد تازہ رکھی۔ بشیر ظفر کا مزدوروں کے حقوق پر سودے بازی نہ کرنا اور محنت کشوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کا پرچم سربلند رکھنا حکمرانوں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوا جس کی وجہ سے حکمرانوں نے انہیں مارشل لاء ضابطوں کا شکار بنایا۔ بشیر ظفر پر الزام ہے کہ انہوں نے مزدوروں کو حکومت کی مزدور دشمن پالیسیوں سے خبردار کیا۔ مزدوروں کی چھانٹیوں، برطرفیوں، تالہ بندیوں اور ان کے خلاف انتقامی کارروائیوں پر صرف احتجاج کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مزدوروں کو "مشتعل" کیا کہ وہ اپنے روزگار کے تحفظ اور حقوق کی خاطر منظم ہو کر جدوجہد کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ کوٹ لکھپت صنعتی علاقے کی صورتِ حال پر اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب سے مارشل لاء نافذ ہوا ہے مزدور جہنم کی آگ میں جل رہا ہے۔ یہ صورتِ حال صرف کوٹ لکھپت تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ملک بھر کے محنت کش اس آگ میں جل رہے ہیں۔

کوٹ لکھپت کے صنعتی علاقے کے مزدوروں میں بے چینی اور غم و غصہ اس وقت انتہا اختیار کر گیا جب حکومت کے معتبر ذرائع نے یہ بات کرنی شروع کی کہ قومی تحویل میں لی گئیں صنعتیں سرمایہ داروں کو واپس کر دی جائیں گی۔ پیداوار میں کمی اور ان صنعتوں کے مقروض ہونے کے بعد یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ سرکاری سیکٹر میں صنعتیں چلانے کی پالیسی ناکام ہو گئی ہے اس کو محنت کشوں نے اپنے روزگار کے لئے شدید خطرہ محسوس کیا۔ فلور ملوں کی واپسی کے بعد جو کچھ ان ملوں کے مزدوروں کے ساتھ ہوا، جس طریقے سے وہ روزگار سے محروم کئے گئے سب کے سامنے تھا، اس لئے اُن کی بڑھتی ہوئی بے چینی حق بجانب تھی۔ اس صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لئے کوٹ لکھپت کے مزدوروں نے عملی اقدام اٹھانے کا پروگرام مرتب کیا تاکہ اتحاد اور جدوجہد کے ذریعے وہ قومی تحویل میں لی گئی صنعتوں کو سرمایہ داروں کو واپس کرنے کے عمل کو روک سکیں اور اپنے روزگار کا تحفظ کر سکیں۔

مزدور رہنما بشیر ظفر کی زیر قیادت مزدوروں نے جلسوں اور گیٹ میٹنگوں کے ذریعے ڈی نیشنلائزیشن کی پالیسی کی ڈٹ کر مخالفت کی اور ڈی نیشنلائزیشن کی صورت میں مزاحمت اور جدوجہد کرنے کا اعلان کیا۔ اس احتجاج کی آواز پورے پنجاب میں سُنی گئی۔ بالآخر سرکاری ذرائع نے گول مول الفاظ میں ڈی نیشنلائزیشن کی تردید کی کہ ایسی کوئی تجویز زیر غور نہیں ہے جس سے مزدوروں کے احتجاج اور غم و غصہ میں کمی واقع ہوئی مگر بشیر ظفر مزدور دشمنوں کی نظروں میں کھٹکتے رہے، ان کا مزدوروں میں رہنا حکومت کی نظر میں صنعتی امن کے لئے خطرے کا باعث بن گیا۔ انہیں گرفتار کر کے مزدوروں سے الگ کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔ ان پر سب سے بڑا الزام جو پولیس کی ایف آئی آر میں درج ہے قابل غور ہے کہ بشیر ظفر نے جلسوں میں تقریر کرتے ہوئے کہا: "تم کہتے ہو ٹیلیفون فیکٹری نو کروڑ روپے کی مقروض ہو گئی ہے اس لئے اسے سرمایہ داروں کے حوالے کر دیا جائے گا۔ میں کہتا ہوں پاکستان اربوں روپوں کا مقروض ہے کل تم اسی بہانے پاکستان کو سامراج کے حوالے کر دو گے کہ یہ ہم سے نہیں چل رہا"۔ حقیقت اور سچائی کی کڑوی گولی حکمرانوں کے حلق سے نہیں اتری۔ سچائی بیان کرنے کی سزا جیل کی سلاخیں ہی ہو سکتی ہیں۔

جیل میں بشیر ظفر کے ساتھ اخلاقی مجرموں سے بدتر سلوک کیا گیا۔ انہیں خطرناک مجرموں کی طرح پاؤں میں بیڑیاں پہنائی گئیں۔ ملاقات پر سخت پابندی عائد کر دی گئی اور قیدِ تنہائی میں رکھا گیا۔ ناقص غذا کی وجہ سے اور جیل کی سختیوں کے باعث بشیر ظفر کی صحت بُری طرح متاثر ہوئی مگر اس جیالے رہنما نے ان ہتھکنڈوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے عزم کو بلند رکھا۔ جیل میں سیاسی کارکنوں کے احتجاج اور باہر سے حکمرانوں کے اس ظالمانہ برتاؤ کے خلاف آوازِ احتجاج سے مجبور ہو کر جیل حکام نے بشیر ظفر کو قیدِ تنہائی سے نکالا، پاؤں سے بیڑیاں اتاریں اور ملاقات کی اجازت دی۔ ان کا مقدمہ اسپیشل ملٹری کورٹ میں پیش کیا گیا ہے۔ مگر ساڑھے تین ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی مقدمہ کی کارروائی شروع نہیں کی گئی کیونکہ اتنے عرصہ میں بھی پولیس مقدمے کا ریکارڈ تک پیش نہیں کر سکی ●●

میاں معین وٹو
سیکرٹری جنرل - پنجاب یوتھ کونسل

چیئرمین بھٹو کے مستقبل کا فیصلہ صرف اور صرف عوام کر سکتے ہیں

پنجاب یوتھ کونسل پنجاب کی مرکزی کمیٹی کے چیئرمین حافظ نور محمد قصوری نے کہا کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کو ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کو سیاسی، معاشی، تعلیمی، اخلاقی اور دفاعی طور پر مستحکم اور مضبوط کرنا چاہتے تھے۔ اتحاد اسلامی کے لئے جمال الدین، علامہ اقبال اور شاہ فیصل شہید نے جو خواب دیکھے تھے چیئرمین بھٹو نے انہیں عملی جامہ پہنانے کی سر توڑ کوششیں کیں۔ لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کا انعقاد، فرانس سے ایٹمی ری پروسسنگ پلانٹ کی خریداری کے لئے معاہدہ اور مسلم ممالک کی مشترکہ دفاعی کونسل کی تجویز عملی ثبوت ہیں۔ حافظ نور محمد قصوری نے ضلع قصور کے دیہی مقامات کوٹ مہتاب خان اور کھارا سنگت سنگھ والا میں عید المبارک اور پیپلز پارٹی کے کارکنوں کے اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان قومی اتحاد کے رہنما چیئرمین بھٹو اور پاکستان پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت پر تنقید کرتے ہوئے کیوں ان کی عظیم خدمات کو بھول جاتے ہیں۔

حافظ نور محمد قصوری نے کہا کہ جو نام نہاد سیول حکومت قائم کی گئی ہے وہ پاکستان کے محبِ وطن عناصر سے مذاق کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ عوام جانتے ہیں کہ مفتی محمود، مولانا مودودی اور نواب زادہ نصر اللہ خان وہ شخص ہیں۔ جنہوں نے قیام پاکستان کی مخالفت کی۔ جبوری حکومت کے اس اقدام نے محب وطن عناصر کو تشویش میں ڈال رہا ہے۔ حافظ نور محمد قصوری نے مزید کہا کہ مارشل لا کابینہ کے وزرا چیئرمین بھٹو کے مستقبل کے متعلق جو باتیں کہہ رہے ہیں اس کا انہیں کوئی حق نہیں کیونکہ چیئرمین بھٹو کے مستقبل کا فیصلہ صرف اور صرف عوام کر سکتے ہیں۔ چیئرمین عوام کے نمائندے ہیں اور ان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق عوام کو ہے اجتماع میں انتخابات کی حتمی تاریخ کا اعلان چیئرمین

بھٹو، بیگم نصرت بھٹو، جنرل ٹکا خان، ممتاز علی بھٹو اور عبدالحفیظ پیرزادہ اور دوسرے سیاسی رہنماؤں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔ نیز قصور پیپلز پارٹی کے کارکنوں، مزدور رہنماؤں اور یوتھ کونسل کے عہدیداروں سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ دیہات کے عوام آج بھی چیئرمین بھٹو کو اپنا قائد مانتے ہیں اور ووٹ کو چیئرمین کی مقدس امانت سمجھتے ہیں اور ان کا عزم ہے کہ ایک بار پھر سرمایہ داری جاگیرداری نوآبادیاتی نظام کے خاتمے اور جمہوریت کی بحالی کے لئے چیئرمین بھٹو، بیگم نصرت بھٹو اور مس بے نظیر بھٹو کی قیادت میں جدوجہد کریں گے۔ مسٹر قصوری نے کہا کہ نوجوانوں کسانوں، مزدوروں اور طلبا میں اپنے حقوق کے حصول کے لئے جو بیداری پیدا ہوئی ہے اس کو ختم کرنے کے لئے رجعت پسند طاقتیں پھر متحد ہو رہی ہیں۔ لیکن اب تاریخ کے دھارے نے فیصلہ ان کے خلاف کر دیا ہے۔ اب دنیا کی کوئی طاقت مزدوروں کسانوں اور طلبا کو ان کے حقوق حاصل کرنے سے نہیں روک سکتی۔ اجتماع میں فخرِ اسلام ذوالفقار علی بھٹو زندہ باد، بیگم نصرت بھٹو زندہ باد، مس بے نظیر بھٹو زندہ باد کے پُرجوش نعرے لگائے گئے اور چیئرمین بھٹو کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا۔

محمد اقبال، سیالکوٹ

باسکو - محنت کشوں کو قانون کی ہیرا پھیری میں مبتلا کر دیا جاتا ہے

باسکو فیکٹری جو کہ جوتے سازی کی صنعت سے تعلق رکھتی ہے جب سے ملک میں سیاسی طور پر تبدیلی آئی اس وقت سے ملک میں محنت کشوں کی زندگی میں مشکلات اور جبر و ستم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ اور سابقہ دورِ حکومت میں دی گئی تمام مراعات سے یک دم محروم کر دیا گیا ہے ہماری فیکٹری میں دو سو کے لگ بھگ محنت کش کام کر رہے ہیں اور اس سال کا بونس جو تین ماہ کے اندر ادا کرنا ہوتا ہے ہمیں ابھی تک نہیں دیا گیا ہے۔ اگر ہم باسکو فیکٹری کے مالکان سے رجوع کرتے ہیں تو ہمیں حساب کتاب میں نقصان بتا دیا جاتا ہے اور محنت کشوں کو قانون کی ہیرا پھیری میں مبتلا کر دیا جاتا ہے اس کے علاوہ چھ ماہ تک کام کرنے کے باوجود سروس کارڈ تک مہیا نہیں کرتے ہیں جس سے یہاں کے محنت کش سوشل سیکورٹی کی سہولتوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر فیکٹری کا کوئی کارکن کام سے استعفیٰ دے دیتا ہے تو اس کو کئی ماہ تک فیکٹری مالکان حساب نہیں دیتے ہیں اور کئی روز تک فیکٹری کے چکر لگانے پڑتے ہیں اگر کسی مزدور کا کام کے دوران ہاتھ کا کوئی حصہ ضائع ہو جاتا ہے تو اس کو معاوضہ تک نہیں ملتا ہے۔ یونین ان کے بارے میں فیکٹری مالکان سے شکایت کرتی ہے تو الٹا فیکٹری مالکان فیکٹری کو بند کرنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ اگر لیبر ڈیپارٹمنٹ سے رجوع کرتے ہیں تو مالکان سے گٹھ جوڑ کر کے ہمیں ٹرخا دیتے ہیں اور ہماری کسی بھی ریاستی ادارے میں شنوائی نہیں ہوتی ہے۔

جماعت اسلامی "پریم" کے نام سے نفرت کا کاروبار کر رہی ہے

مرزا ابراہیم اور ریلوے کے مزدوروں کے لئے ایک اور چیلنج

جماعت اسلامی نے سیاست ہی میں اسلام کی دکان نہیں کھولی بلکہ مزدور تحریک کی پشت میں بھی اسلام کا نام لے کر چھرا گھونپا۔ سیاست کی طرح محنت کشوں کی تنظیموں میں گھس کر تفرقہ اور منافقت کی بنیاد ڈالی اور ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کیا اور یہ سب کچھ اسلام کے نام پر کیا گیا۔ کمیونسٹوں کا ہوا کھڑا کر کے سیدھے سادے محنت کشوں کو آپس میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا۔

ریلوے کے محنت کشوں کو متحد اور منظم کرنے میں مرزا محمد ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کی خدمات سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اس سلسلے میں انہیں اور ان کے کارکنوں کو متعدد بار قید و بند کی سزائیں ہوئیں۔ ان کی ٹریڈ یونین کے کارکنوں کو ملازمتوں سے معطل اور برطرف کیا گیا۔ ان پر روزگار کے دروازے بند کئے گئے۔ ان کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کی گئیں۔ مگر انہوں نے ہتھیار نہیں ڈالا اور تمام چیلنجوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اپنی قربانیوں اور امتحانوں کے نتیجے میں ریلوے کے مزدوروں کے حالات کار اور روزگار کے تحفظ کے سلسلے میں کافی ضمانتیں اور مراعات حاصل ہوئیں اور سب سے نتیجہ خیز بات یہ تھی کہ ریلوے کے مزدوروں کے درمیان وسیع تر اتحاد قائم ہوا۔ لیکن یہ ساری باتیں جماعت اسلامی جیسی عوام دشمن پارٹی کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی رہیں۔

علاوہ ازیں جماعت کا یہ ہی منصوبہ رہا ہے کہ تمام اہم اور حساس اداروں پر کسی نہ کسی طرح قبضہ کیا جائے تاکہ پارٹی کو غیر آئینی اور غیر جمہوری طریقے سے اقتدار میں لانے کے لئے ان کے وسائل اور اثرات استعمال کئے جا سکیں۔

جماعت اسلامی کچھ سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں گھستے اور اسلام کا نام استعمال کر کے ان کی ٹریڈ یونینوں پر قبضہ جمانے میں کامیاب رہی۔ مگر بعض ادارے ایسے ہیں جہاں اپنی تمام تر سازشوں اور منافقتوں کے باوجود اس کے پاؤں جم نہ سکے۔ ان میں سے ایک ریلوے کا وسیع ادارہ ہے۔ لیکن اب جماعت نے ترقی پسند ٹریڈ یونین کی متوازی ایک نئی یونین بنانے کے منصوبے پر عملدرآمد شروع کر دیا ہے۔ اس کا نام "پریم" رکھا ہے۔ اغراض و مقاصد میں "پریم" یعنی "محبت" کو نفرت میں تبدیل کرنے کے لئے ریلوے کی مزدور تنظیموں اور ان کے اتحاد پر کیچڑ اچھال کر مذاق اڑانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً ترقی پسند ٹریڈ یونین کے بارے میں ریمارک دیا گیا ہے کہ "کچھ لوگ ضمیر کی دکانیں سجائے رکھنا چاہتے ہیں، تاکہ تجارت چلتی رہی۔ مزدوروں کے مسائل کو الجھانا چاہتے ہیں۔ تاکہ ان کی بپھری ہوئی قوت کو پاکستان میں تخریب کاری اور سوشلزم کے سفلی مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکے"۔

مذکورہ ریمارک سے ان کی بدخصلتی، بدنیتی اور مذموم ارادوں کا اظہار ہوتا ہے۔ کیا یہ کمال نہیں ہے کہ ٹریڈ یونین ہم تک اور اس کے رہنماؤں کو گالیاں دے کر ٹریڈ یونین کی نئی راہیں تلاش کرنے والے محنت کشوں کو اسلام کے نام پر فریب دے کر ایک نئی دکان کھولنے کا لائسنس حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ جیسا کہ انہوں نے متعدد نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں انجام دیا۔ پی آئی اے میں بارگنگ ایجنٹ پیاسی کا کیا حشر ہے۔ پچھلے ہی دنوں صدر اور جنرل سکریٹری کے درمیان جوتوں لٹھ، مار پیٹ اور گالم گلوچ ہوئی، کیا اس بات کا ثبوت نہیں کہ جماعت محض اپنے خفیہ مقاصد اور اپنی اختراع "اسلام" کی ٹھیکیداری جمانے کے لئے ملازمین اور محنت کشوں میں پھوٹ ڈالنے کی اسکیم پر عمل پیرا ہے۔ چونکہ ریلوے میں مرزا ابراہیم کی یونین موثر اور مضبوط ہے اور اس کی ملازمین اور مزدوروں میں گہری جڑیں ہیں لہٰذا اس تناور درخت کو کاٹنے چھانٹنے کے لئے یہاں بھی جماعت اسلامی اسلام کے نام لے کر متوازی یونین قائم کرنا چاہتی ہے لیکن شاید جماعت والوں کو پتہ نہیں کہ اس کے فریب کا پردہ چاک ہو چکا ہے۔ باشعور مزدوروں نے اسے مسترد کر دیا ہے۔ اور ریلوے کے محنت کش بھی جماعت اسلامی اور اس کے ایجنٹوں کو ردی کاغذ کی طرح پھاڑ کر گھورے پر پھینک دیں گے۔

گندم کی قیمت میں اضافہ واپس لیا جائے۔ سرخ پرچم مزدور محاذ

محاذ صحافیوں کی جدوجہد میں عملاً حصہ لینے کے لئے تیار ہے

ریلوے ملازمین انقلابی یونین اور سرخ پرچم مزدور محاذ کے رہنما جعفر خاں۔ مہر عبدالرشید۔ حنیف کھوکھر سیف الرحمٰن نے اپنے مشترکہ بیان میں بجٹ کے بعد یکدم ۵۰ فیصد مہنگائی ہونے پر گندم کی قیمت خرید میں اضافہ پر صحافیوں، مزدوروں، کسانوں کی چھانٹیوں بے دخلیوں اور گرفتاریوں پر سخت تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ملک کی نوکر شاہی، جاگیرداروں سرمایہ داروں کے اشارہ پر ملک کے عوام کے خلاف کام کر رہی ہے۔ صنعتی اداروں سے برطرفیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ کسانوں کو بے دخل کیا جا رہا ہے۔ پولیس نوکر شاہی کے ایما پر مزدوروں، کسانوں، صحافیوں اور طلبا پر تشدد کر رہی ہے۔ جس سے عوام اور ریاستی مشینری کے خلاف نفرت بڑھ رہی ہے جس سے ملک کی سالمیت کو خطرہ درپیش ہو سکتا ہے، اس لئے پاکستان کے محب الوطن عوام دوست محنت کش اس خطرے کو محسوس کرتے ہوئے عبوری سول حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ گندم کی قیمت میں اضافہ واپس لیا جائے۔ مہنگائی ختم کی جائے۔ بنیادی اشیا دالیں آٹا۔ چینی۔ گھی۔ کپڑا۔ ایندھن۔ سبزیاں، ٹرانسپورٹ سستا کیا جائے۔ تنخواہوں میں گرانی کے تناسب سے اضافہ کیا جائے۔ انسانی قوت پر انحصار کرنے والی صنعت کاری پر دیا جائے۔ بے روزگاری ختم کی جائے۔ طالب علموں کو تعلیمی صلاحیت کے مطابق روزگار فراہم کیا جائے۔ مہنگائی پیدا کرنے والے عناصر سمگلروں ذخیرہ اندوزوں، بلیک مارکیٹروں، آڑھتیوں کو کڑی سزائیں دی جائیں جنہوں نے غریب عوام کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ چھانٹیاں۔ برطرفیاں۔ گرفتاریاں۔ انتقامی کارروائیاں فوراً بند کی جائیں۔ صحافیوں۔ طلبا۔ مزدوروں، ہاریوں، کسانوں پر پولیس تشدد بند کیا جائے۔ صحافیوں کے ساتھ

محاذ آرائی ختم کرکے ان کے نمائندے منہاج برنا، نثار عثمانی حفیظ راقب سے مذاکرات کرکے ان کے مسائل حل کئے جائیں۔ ٹی وی کارکنوں کو نوکریوں پر بحال کیا جائے۔ گرفتار تمام مزدوروں۔ کارکنوں۔ ہاریوں، صحافیوں اور طلبا کو رہا کیا جائے۔ "الفتح"۔ "معیار"۔ نوائے جنگ وغیرہ کے ڈیکلریشن بحال کئے جائیں صحافت پر پابندیاں ختم کی جائیں۔ آزاد ٹریڈ یونین سازی اور ہڑتال کا حق بحال کیا جائے۔ بیان میں صحافیوں کی ہر ممکن حمایت اور تعاون کی یقین دہانی کرائی گئی۔ انہوں نے کہا سرخ پرچم مزدور رہنماؤں کے ساتھ عملی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے تیار ہے۔

* * *

بھٹو کا فیصلہ کارٹر نہیں عوام کریں گے

پاکستان میں مودودی کا اسلام نہیں چلے گا

مرزا سلیم

پاکستان پیپلز پارٹی ضلع جہلم کے جواں سال رہنما جناب پرویز اعوان ایڈووکیٹ نے مقامی کارکنوں کے اعزاز میں ایک پارٹی ترتیب دی۔ ماہِ رمضان کی آخری تاریخ ہے۔ لوگوں کا ایک ہجوم ہے۔ تقریباً بیس کنال کے احاطے میں شامیانے اور جھنڈیاں لگا دی گئی ہیں اس اجلاس میں مہمان خصوصی جناب احمد وحید اختر سینیٹر ضلع کیمبل پور بھی آتے ہیں۔ ان کے علاوہ آنسہ زاہدہ مجید بھی آچکی ہیں۔ اجلاس کی صدارت معروف سماجی ورکر بابا عید محمد نے کی۔ بعدازاں مشہور ورکر سلیم مجاہد تحصیل جہلم کے صدر راجہ مختار احمد، ضلع جہلم کے صدر سید محمد عباس شاہ نے حاضرین جلسہ سے خطاب کیا۔ حضرت سلیم مجاہد نے اپنی مخصوص گونج دار آواز میں کہا کہ ہم نے اس مبارک مہینے میں اپنی انقلابی جدوجہد کا راستہ متعین کرنا ہے۔ بھٹو کی جان ہم پنجاب میں تحریک چلا کر بچا سکتے ہیں کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ باقی صوبوں کی نسبت پنجاب میں کوئی خاص تحریک نہیں۔ ہم ہی لوگوں نے اسے تخت پر بٹھایا تھا۔ کیا اب تختے پر چڑھانا بھی ہمارے ہی مقدر میں ہے؟ بھٹو آپ کے، سب لوگوں کے قائد تھے۔ اُسے کارٹر کیسے اتار سکتا ہے۔ ہمارا قائد جیل میں نہیں رہ سکتا ہم اس طاقت کو ضرور بے نقاب کریں گے، جو ہم لوگوں سے قائد عوام چھین کر لے گیا ہے۔ بعدازاں راجہ مختار احمد صدر پاکستان پیپلز پارٹی تحصیل جہلم نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہم قائد عوام کے مشکور رہیں کہ ہمیں انہوں نے سیاسی شعور دیا۔ بھٹو غریبوں کے لئے ہے تمام دنیا کے لئے ہے، پاکستان کے لئے ہے یہاں بھی غریبوں کا استحصال ہو رہا ہے۔ جب سے بھٹو صاحب گئے ہیں آپ دیکھ رہے ہیں کہ غریبوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ صحافیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ سڑکوں پر ذلت آمیز طریقے سے گھسیٹا جا رہا ہے۔ ساتھ ساتھ جمہوریت کا جھوٹا پرچار بھی کیا جا رہا ہے۔ پاکستان کے عوام مودودی کا اسلام نہیں مانتے۔ یہاں کے مسائل کا حل صرف سوشلزم کے نفاذ میں مضمر ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ بڑے بڑے سرمایہ دار جو بظاہر ایک دوسرے کو سیاسی طور پر گالیاں دیتے ہیں لیکن سرمایہ دارانہ نظام کے تحفظ کے مسئلہ پر وہ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا ہو کر اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اس ملک سے سامراج کے اثر و رسوخ کا خاتمہ نہایت ضروری ہے"

سید محمد عباس شاہ ضلعی صدر نے کہا کہ "ظہورے" "غفورے" نے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ برسرِ اقتدار آ کر قیمتوں کو ۱۹۷۰ء کی سطح پر واپس لے آئیں گے مگر پہلا تحفہ گندم کی سرکاری قیمت خرید ۳۷ روپے سے بڑھا کر ۵۷ روپے کی شکل میں عوام کو دیا گیا۔ یہ عوام کو بیوقوف بنانے کا پہلا حربہ ہے۔ اس طرح وہ جاگیرداروں، پیروں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

آخر میں جناب احمد وحید اختر سابق سینیٹر نے کہا کہ گذشتہ پندرہ مہینوں سے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ لیکن پابندی تھی کہ کوئی بات نہ کرے۔ بند کمرے میں آپ بات نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جن لوگوں کو اس سٹیج سے محبت تھی وہ بات کرتے رہے۔ ہم نے ہمیشہ کہا ہے کہ فیصلہ لوگوں کو کرنا ہے۔ عوام الناس کی رائے سے فیصلہ ہونا ہے۔ لوگوں کو نااہل کرنے کا چکر ختم کریں۔ دراصل اس چکر سے عوام کو چکرایا جا رہا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد کو جو کافی عمر امریکہ گزار چکے ہیں اگر مسلمان ہونے کے ناطے اور اسلام کی محبت کی وجہ سے وزیر بنانا ہے تو پھر ایران، انڈونیشیا سے بھی وزیر بنایا جائے۔ بار بار اسلام کا نام لینا اصل مسائل کو الجھانا ہے۔ خورشید احمد جو دراصل جماعت کے گیارھویں وزیر ہیں، کہتے ہیں کہ پاکستان کو ضرورت تھی اور میں آگیا۔ اور وہ لوگ جن کو لوگوں نے ووٹ دیئے وہ پس دیوارِ زنداں ہیں۔ دنیا میں ایسی کوئی مثال نہیں کہ منتخب اسمبلی کو ایسے ہٹایا جائے۔ اگر بیس برس کے بعد بھی انتخابات ہوئے تو پیپلز پارٹی ہی آئے گی۔ جناب بزنجو نے ٹھیک کہا ہے۔ کوئی نئی بات نہیں کی۔ یہ تمام باتیں ۱۹۷۳ء میں بھی کہہ چکے ہیں، اُس وقت چوہدری ظہور الٰہی نے کہا تھا کہ اگر یہ غدار ہیں تو میں بھی غدار ہوں۔ تو آج وہی آدمی جنتا سے مل کر کہتا ہے کہ زبانیں گُدی سے کھینچ لی جائیں گی۔ ہم نے حکمران ٹولے سے ہمیشہ کہا ہے کہ انتخابات نہ ہوتے تو ملک کو نقصان ہوگا۔ ایران کے عظیم عوام ظلم و جبر کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔ افغانستان میں اندھیرا چھٹ چکا ہے اور انصاف کا نور پھیل رہا ہے۔ ہم کنفرنٹیشن نہیں کر رہے لیکن یکطرفہ ٹریفک جاری ہے۔ ڈرو اس وقت سے جب بھوکے ننگوں کے جلوس نکلیں گے انہیں سنبھالنا مشکل ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ انتخابات کرا دو۔

تقریب میں سوشلزم آوے ہی آوے، صحافیوں کو رہا کرو۔ منہاج برنا کو رہا کرو کے نعرے لگائے گئے۔
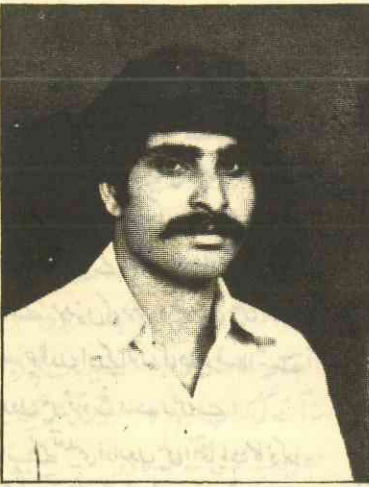
جماعتیئے قاتلوں کی ضمانتیں ہو رہی ہیں

انعام و اکرام سے نوازا جا رہا ہے

طلبہ تاریخ ساز کردار کے لئے تیار ہو جائیں!

کاشف

نیشلسٹ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن پنجاب کی دیگر ترقی پسند طلبہ تنظیموں کے ساتھ رجعت پسند اور استحصالی قوتوں کے خلاف جد وجہد میں برابر کی نبرد آزما ہے۔ این ایس او پنجاب کے تعلیمی اداروں اور خصوصاً پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی جمعیت طلبہ کی غنڈہ گردی کا تمام تر مشکل حالات کے باوجود مقابلہ کر رہی ہے۔ گذشتہ دنوں اسلامی جمعیت طلبہ کی مخبری پر اس کے چیئرمین مشتاق گھمن کو جھوٹے بم کیس میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کرا دیا گیا۔ اس کے علاوہ این ایس او اسلامیہ کالج کے کنوینر برکات احمد کا قاتل جاوید ہاشمی جنرل ضیاء الحق کا نورِ نظر بنا ہوا ہے۔ اسی طرح ایف سی کالج میں بی اے کا طالب علم اور این ایس او کا سرگرم کارکن امین اللہ خان کو بھی اسلامی جمعیت طلبہ کے درندے "مودودیوں" نے انتہائی بہیمانہ طریقے سے قتل کر دیا۔ اور مومنوں کے موجودہ دورِ حکومت میں ان قاتلوں کی نہ صرف ضمانتیں ہو گئیں بلکہ انہیں انعام و اکرام سے بھی نوازا گیا ہے۔ اور جاوید ہاشمی وزیر بن کر عیاشیاں کر رہا ہے۔

گذشتہ دنوں این ایس او کے ایک وفد نے چیئرمین مشتاق گھمن کی قیادت میں ملک بھر میں ترقی پسند طلبہ کو متحد کرنے اور ان کا ایک کنونشن بلانے کی ضرورت کی غرض سے چاروں صوبوں کے تعلیمی اداروں کا دورہ کیا۔ اور ہم خیال طلبہ تنظیموں کے نمائندوں سے ترقی پسندوں کے مشترکہ پلیٹ فارم کی تشکیل پر تبادلۂ خیال کیا۔ اس سلسلے میں این ایس او کا وفد جامعہ کراچی بھی آیا۔ اس موقع پر این ایس او کے چیئرمین مشتاق گھمن نے ملک کی موجودہ صورتِ حال کے پس منظر میں ترقی پسند طلبہ تنظیموں کے کردار پر ہمارے ایک سوال کے جواب میں کہا۔ "آج ہماری سیاست دو پول میں تقسیم ہے۔ ایک طرف عوام دشمن اور استحصالی قوتیں ہیں جو غیر سیاسی قوتوں کی حمایت کر رہی ہیں جب کہ دوسری جانب عوام دوست قوتیں ہیں جو جمہوریت اور آئین کی بالادستی پر یقین رکھتی ہیں اور سماجی و اقتصادی نظام میں یکسر تبدیلی چاہتی ہیں، لہٰذا اس صورتِ حال میں طلبہ کو اپنا اہم کردار ادا کرنا ہے۔ یہ کہنا کہ طلبہ کو سیاست میں حصہ نہیں لینا چاہیئے اور اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہیئے ایک احمقانہ نصیحت ہے۔ کیونکہ موجودہ سیاسی بحران سے نہ صرف نوجوان طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہو رہا ہے بلکہ ان کا مستقبل بھی ڈانواں ڈول ہوتا جا رہا ہے۔ پاکستان بنانے والوں نے اپنی آئندہ نسل کی خوشحالی، ترقی اور اس کے روشن مستقبل کے لئے یہ ملک حاصل کیا تھا۔ لیکن آج ایک پوری نسل تاریکی اور گھٹن کے دور میں پروان چڑھ چکی ہے۔ اور آنے والا مستقبل بھی خوفناک تاریکی کی نوید دے رہا ہے لہٰذا اب وقت آ گیا ہے کہ اس ملک کے نوجوانوں کو اپنی اہم ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے تاریخ ساز کردار ادا کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔ لہٰذا طلبہ اپنے آپ کو ملک کے موجودہ سیاسی بحران سے کسی طرح بھی علیحدہ نہیں رکھ سکتے۔

تعلیمی اداروں میں اسلامی جمعیت طلبہ کی غنڈہ گردی کا ذکر کرتے ہوئے مشتاق گھمن نے کہا جب سے مومنوں نے حکومت سنبھالی ہے جمعیت نے خفیہ پولیس کا کردار ادا کرنا شروع کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایف ایس ایف کے اغراض و مقاصد اسی کے حوالے کر دیئے گئے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں اسی تنظیم کی جانب سے مار دھاڑ، قتل، دہشت گردی کو موجودہ حکومت کی بھرپور حمایت و پشت پناہی حاصل ہے۔ اور اس کی حوصلہ افزائی کے طور پر سرکاری حج وفد میں اسلامی جمعیت طلبہ کے ناظم کو وی آئی پی کا درجہ دے کر بھیجا گیا۔

تعلیمی اداروں اور خصوصاً پنجاب یونیورسٹی میں اسلامی جمعیت طلبہ کی غنڈہ گردی کے نتیجے میں تعلیمی ادارے "میکسیکو اور نیویارک" بن گئے ہیں۔ جمعیت کے کارکن پستولوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر جب چاہتے ہیں ہوسٹلوں میں اپنے مخالفین طلبہ کے کمروں میں گھس جاتے ہیں انہیں بری طرح زد و کوب کرتے ہیں۔ بسا اوقات ان کا سامان کمروں سے نکال کر باہر پھینک دیتے ہیں۔ اس طرح پورے ماحول پر خوف و ہراس کی فضا قائم کر دی جاتی ہے تاکہ کوئی اسلامی جمعیت طلبہ کے سامنے سر نہ اٹھا سکے۔ این ایس او پنجاب کے چیئرمین پرویز ملک کو بھی اسی طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ این ایس او لاہور کے سیکریٹری طاہر اعوان کو گرفتار کرایا گیا۔ اس کے علاوہ این ایس او کے سرگرم رکن محفوظ ملک کے وارنٹ گرفتاری نکلوا دیئے۔ جمعیت کے مخبر اور غنڈے نہ صرف طلبہ کے ساتھ اس طرح کی غنڈہ گردی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ اُن کی دہشت گردی سے طالبات بھی محفوظ نہیں ہیں۔ جمعیت کے غنڈے طالبات کے ہوسٹلوں میں گھس جاتے ہیں اور انہیں اسلامی جمعیت طلبہ کی حمایت نہ کرنے پر فحش گالیاں دیتے ہیں اور انہیں کمروں سے اٹھا کر لے جانے کی دھمکیاں بھی دیتے ہیں۔ اسی طرح جمعیت کے غنڈے اساتذہ کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی کے بعض اساتذہ ان کی غنڈہ گردی کا شکار بھی

بن چکے ہیں۔ مومنوں کی حکومت آنے کے بعد جمعیت کے غنڈوں نے پنجاب بھر کے تعلیمی اداروں سے روشن خیال اساتذہ کی فہرستیں تیار کیں اور ان میں سے بعض کی نوکریاں ختم کرانے کی سفارش بھی کی۔ جب کہ بعض اساتذہ کے دُور دراز علاقوں میں تبادلے کروا دیئے گئے۔ مومنوں کی موجودہ حکومت میں اسلامی جمعیت طلبہ جوڑوں اور کراٹوں کی جدید تسلطائیت تعلیمی اداروں میں فروغ دے رہی ہے۔

پنجاب کے تعلیمی اداروں میں انتخابات کا ذکر کرتے ہوئے گھمن نے کہا "انجنیئرنگ یونیورسٹی، نشتر میڈیکل کالج اور پنجاب کے دیگر کالجوں میں اسلامی جمعیت طلبہ کی ذلّت آمیز شکست سے خائف ہو کر المنصورہ کی حکومت نے پنجاب بھر کے تعلیمی اداروں میں انتخابات غیر معیّنہ مدّت کے لئے ملتوی کروا دیئے۔ محکمہ تعلیم کو خصوصی ہدایات جاری کر دی گئی ہیں اور آزاد خیال اور ترقی پسند خیال کے حامی طلبہ کو انتخابات میں حصّہ لینے سے روکنے کے لئے نئے ہتھکنڈے اور قوانین تشکیل دیئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں تھرڈ ڈویژن کے طلبہ کے انتخابات میں حصّہ لینے پر پابندی پہلا اقدام ہے۔ ادھر المنصورہ کی حکومت بھی پنجاب کے تعلیمی اداروں میں انتخابات سے قبل ان کے نامزد امیدواروں اور کارکنوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریوں کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اس کے خفیہ پولیس کے طور پر دو فوجی کپتانوں کو پنجاب یونیورسٹی میں ایم بی اے اور ایم پی اے میں مخصوص نشستوں پر داخلے ہو جانے کے خاصے عرصے بعد خصوصی نشستیں قائم کر کے داخلے دے دیئے گئے ہیں۔ جو کہ ایک غیر قانونی اقدام ہے اور یونیورسٹی کے اصولوں سے انحراف کیا گیا ہے۔

صحافیوں کی تحریک کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے مشتاق گھمن نے کہا "پی ایف یو جے اور ایپنک اخباری صنعت کے کارکنوں کی وہ واحد جماعتیں ہیں جو ملک میں آزادیٔ صحافت کی بحالی کے لئے گذشتہ ۳۱ سال سے اپنے اصولوں پر کاربند ہے۔ ان تنظیموں نے ہر دور میں آزادیٔ صحافت کے لئے جدوجہد کی ہے اور اظہارِ خیال کی آزادی کے لئے جو ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ اس کے لئے تحریکیں چلائی ہیں۔ مومنوں کی موجودہ حکومت نے بھی آزادیٔ صحافت بحال کر دینے کے ڈھول پیٹے تھے۔ لیکن اپنے چہرے سے مومن کی نقاب کو خود اپنے ہاتھوں سے نوچتے ہوئے اس پر عمل نہیں کیا جو کہا تھا۔ ان کے قول و فعل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

این ایس او صحافیوں کی موجودہ تحریک کی بھرپور حمایت کرتی ہے اور اس تحریک میں صحافی برادری کے دوش بدوش کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گی۔ جب بھی صحافی بھائیوں کو ہماری ضرورت ہو گی ہمیں صفِ اوّل میں پائیں گے۔

**

پاکستان کا دارالخلافہ لاہور بتانے والا تحصیلداری کیلئے منتخب

انٹرویو لینے والوں نے امیدواروں کی جاگیرداری کو معیار بنایا

روشن ملک

ضلع میانوالی میں تحصیلداروں کی بھرتی کی تاریخ ۲۴ اگست ۱۹۷۸ء تھی اور جس نوٹیفکیشن کے تحت درخواستیں طلب کی گئی تھیں۔ اس میں عمر کی حد ۱۸ اور ۲۱ سال کے درمیان رکھی گئی تھی۔ جب انٹرویو ہوئے تو اکثریت غریب طلباً کی تھی جو مطلوبہ شرائط پر پورے اترتے تھے لیکن نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے انٹرویو لینے والوں کو مجبور کر دیا کہ وہ مطلوبہ شرائط پر پورے نہ اترنے والے جاگیرداروں کے نونہالوں کو بھرتی کریں۔ مثال کے طور پر چنے جانے والے ۳ امیدواروں کی عمریں ۲۱ اور ۲۵ سال کے درمیان ہیں اور ایک امیدوار نے اس سوال کے جواب میں کہ "پاکستان کا دارالخلافہ کہاں ہے؟" "لاہور" کہا تھا اور منتخب ہو گیا تھا۔ غریب باصلاحیت اور شرائط کی تکمیل کرنے والے امیدواروں کے ساتھ جو زیادتی ہوتی اس کی ذمہ داری کون قبول کرے گا؟

اس صورتِ حال کے بارے میں جمعیت العلمأ پاکستان کے سکریٹری جنرل مولانا عبدالستار خان نیازی نے کہا کہ یہ سفارشی کاروبار ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اس انتخاب کو کالعدم قرار دیا جائے اور یہ ذمہ داری پبلک سروس کمیشن پنجاب کے حوالے کی جائے۔ اور ڈپٹی کمشنروں سے بھرتی کے اختیارات واپس لئے جائیں۔

دریں اثنا تحصیلداری کے دو امیدواروں خالد ملک اور ممتاز احمد خان نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ اہل مگر غریب امیدواروں کی سراسر حق تلفی کی جا رہی ہے اور یوں لگتا ہے کہ حکومت کی مرضی سے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کی اولاد کو چاہے وہ نااہل ہی کیوں نہ ہو انتظامیہ کا ستون بنایا جا رہا ہے۔

تحصیلداروں کے چناؤ کے سلسلے میں ایک اور دلچسپ حقیقت سامنے آئی ہے کہ امیدواروں سے جو فارم پُر کرائے گئے ہیں ان میں ان سے پوچھا گیا ہے کہ وہ گھوڑ سواری جانتے ہیں یا نہیں۔ کیونکہ ابھی تک تحصیلداروں کو انگریزوں کے زمانے کے مبلغ ۳۷ روپے ۵۰ پیسے گھوڑا الاؤنس ملتا ہے جب کہ گھوڑے کسی تحصیل میں نہیں رکھے جاتے۔ اسی طرح تھانیداروں کو بھی گھوڑا الاؤنس ملتا ہے اور کسی تھانے میں گھوڑے نہیں پائے جاتے۔ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حکومت کتنی وفاداری کے ساتھ انگریزوں کے بخشے ہوئے ورثے کی نگہداشت کرتی ہے۔

اسی طرح ایکس ای این کالا باغ کے ذریعے پٹواریوں کی بھرتی میں بھی دھاندلی کی گئی اور مبیّنہ طور پر رشوت لے کر آدمی بھرتی کئے گئے۔ اور من مانی کرنے کے لئے کالا باغ انٹرویو کمیٹی کی تیار کردہ فہرست پھاڑ کر پھینک دی گئی۔ اور انتظامیہ سے متعلق ایک آدمی کے توسّط سے ۱۶ آدمیوں کو انٹرویو کے بغیر بھرتی کر لیا گیا۔

نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی پنجاب کے صدر راؤ مہروز اختر، پیپلز کسان کمیٹی پنجاب کے سکریٹری جنرل سلطان ملک، پنجاب نمبرداری مکاؤ تحریک کے سکریٹری جنرل اے۔ جی عادل۔ پنجاب ٹاؤٹ مکاؤ تحریک کے سکریٹری جنرل پیامی نے حکومت پنجاب سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ تحصیلداروں اور پٹواریوں کے دوبارہ انٹرویو لے کر حق تلفی کا خاتمہ کرے۔

●

حکومت ایوب خاں کے دور کا تجربہ کرنا چاہتی ہے

انتخابات کے بغیر ملک ایک بڑے بحران میں مبتلا ہو جائے گا

پیپلز پارٹی فیصل آباد کے نائب صدر جناب ذوالقرنین ایڈووکیٹ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ موجودہ حکومت کے نامزد وزیر چوہدری ظہور الٰہی کے اس بیان کے بعد کہ حکومت دسمبر میں بلدیاتی انتخابات کرانے کا ارادہ رکھتی ہے، عام آدمی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلدیاتی انتخابات کے لئے فہرستوں کی ضرورت ہوگی۔ پولنگ کا عملہ اور بیلٹ باکس درکار ہوں گے۔ یہ تمام انتظامات وہی ہیں جو عام انتخابات کے انعقاد کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ بلکہ زیادہ امیدوار ہوں گے اور زیادہ عملہ کے ارکان بھی مصروف ہوں گے۔ تو کون سا ایسا عمل ہے جو عام انتخابات منعقد کروانے سے روک رہا ہے سوائے اس بات کے کہ جنرل صاحب کو مثبت نتائج کی توقع نہیں ہے۔

اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ قومی اتحاد کی توڑ پھوڑ اور پیپلز پارٹی کے لئے عوام کی واضح حمایت کے بعد حکومت کے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا ہے کہ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے عوام کو اقتدار سے دور رکھا جا سکے۔ جس دن سے موجودہ حکومت نے اقتدار سنبھالا ہے یہ نظر آرہا ہے کہ حکومت ایوب خان کا سنہری دور واپس لانے کی کوشش میں مصروف ہے حکومت کی پالیسیاں جن میں سرمایہ داروں کی واضح حمایت کی جارہی ہے۔ بجٹ، درآمدی پالیسی، صنعت کاروں اور تاجروں کی کابینہ میں شمولیت، تمام کارخانہ داروں کو ٹیکسوں میں رعایت وغیرہ سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ایوب خاں کے دور کے سرمایہ دارانہ رجحانات کو مستحکم کرنے کے لئے راہ ہموار کی جارہی ہے۔

جناب ذوالقرنین نے کہا کہ ایک طرف تو سیاسیات کے مسلّمہ بین الاقوامی اصول ہیں جن میں سرِ فہرست یہ ہے کہ کسی ریاست میں جب تک سیاسی استحکام نہ ہو، تو معاشی استحکام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ عوام کے مسائل کا حل ایک منتخب سیاسی حکومت کے پاس ہوتا ہے نہ کہ چور دروازوں سے اقتدار میں داخل ہونے والوں کے پاس۔ عالمی تاریخ عمومی طور پر اور پاکستان کی تیس سالہ تاریخ خصوصی طور پر گواہ ہے کہ جب بھی سیاسی مسائل کے سیاسی حل تلاش کرنے کی بجائے فوجی حل کرنے کی کوشش کی گئی، ملک کے مسائل اور عوام کی تکالیف میں اضافہ ہوا۔ بنگلہ دیش کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک سیاسی مسئلہ کو غیر سیاسی طریقوں سے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ اقتدار کا نشہ غالباً سب سے پہلے آنکھوں پر اثر انداز ہوتا ہے کہ صاحب اقتدار کو مسائل نظر آنے بند ہو جاتے ہیں۔ اگر نیک و بد سمجھانے کی کوشش کی جائے تو ملک دشمن تصور کیا جاتا ہے لیکن ایک محبِ وطن شہری کی حیثیت سے میں آج بھی حکومت کے علم میں یہ بات لانا ضروری سمجھتا ہوں کہ عوام کے مسائل کا واحد حل فوری انتخابات ہے۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا طریقہ ملک کو کسی بڑے بحران میں مبتلا کر دے گا جس کا مجھے یقین ہے کہ اب یہ ملک متحمل نہیں ہو سکتا۔ موجودہ حکومت کو کوئی ایسی بات پسند نہیں ہوگی جو اسے اقتدار سے دور کر دے۔

جناب ذوالقرنین نے کہا کہ حکومت ایک اور تجربہ ایوب خاں کے دور کا کرنا چاہتی ہے کہ بلدیاتی اداروں کے ارکان کا انتخاب کروایا جائے اور جو لوگ منتخب ہو کر آئیں ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ دو لاکھ ہو۔ ان کو ایوبی دور کے ارکان بنیادی جمہوریت کی حیثیت دی جائے۔ دو لاکھ افراد سے حکومت اپنے ذرائع کے ساتھ مثبت نتائج نکلوا سکتی ہے۔ اس کے بعد بین الاقوامی طور پر اور اندرونی طور پر یہ کہا جائے کہ عوام کے منتخب ارکان نے فیصلہ دے دیا ہے۔ اس طرح عوام کو اقتدار سے دور رکھنے کی سازش کی جارہی ہے۔ موجودہ حکومت کو اقتدار کے نشہ کی وجہ سے یہ بات پھر بھی سمجھ میں نہ آئے گی کہ اب عوام کا شعور ترقی کر چکا ہے اور وہ ایوب خاں کے بنیادی جمہوریت کے نظام کو جس کے خلاف عوام نے پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں زبردست تحریک چلائی تھی، دوبارہ خود پر مسلط نہیں ہونے دیں گے۔ اگر اس دور میں عوام نے ایک نظام کو مسترد کر دیا تو آج کے دور میں یہ کب ممکن ہے جب ترقی پسند قوتیں ساری دنیا میں متحد ہو رہی ہیں، تمام دنیا کے مظلوم طبقات اکٹھے ہو کر ظالموں کے خلاف، سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔

تاریخ میں اب یہ بات واضح طور پر سامنے آگئی ہے کہ یہ گلا سڑا سامراجی نظام اب دنیا میں آخری سانس لے رہا ہے۔ مظلوم اقوام اکٹھے ہو کر اس نظام کے خلاف آخری کاری ضرب لگانے کے لئے تیار ہیں تو ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ ایسے ملک میں جہاں غریب عوام متحد ہوں، ایک ایسا نظام مسلط کرنے کی سازش کامیاب ہو جائے جو صرف سرمایہ داروں کا تحفظ کر سکے کیا عوام کے لئے یہ بات سمجھنا مشکل ہے کہ ان کو رائے دینے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ ایک طرف تو سول حکومت بن چکی ہے۔ حکومت میں سیاسی لوگ شامل ہیں۔ حکومت کا دعویٰ ہے کہ صورتِ حال مکمل طور پر حکومت کے قابو میں ہے اور امن و امان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اب اگر حالات پر امن ہیں، حکومت مستحکم ہے تو بلدیاتی انتخابات کا ڈھونگ رچانے کی کیا وجہ ہے؟ کیا اس طرح عوام کو دھوکا دیا جا سکتا ہے؟ ہم بلدیاتی انتخابات کے خلاف نہیں ہیں لیکن اگر سیاسی عمل کو الٹی جانب سے شروع کیا جائے تو اس کے نتائج الٹے ہی نکلیں گے۔

جناب ذوالقرنین نے کہا کہ پیپلز پارٹی بنیادی طور پر اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں اور کسی دوسری طاقت کو بالادستی حاصل نہیں ہو سکتی۔ عوام کے فیصلے درست ہوتے ہیں اور عوام ہی یہ اختیار رکھتے ہیں کہ وہ ملکی اقتدار اپنے نمائندوں کو سونپ دیں۔ کیونکہ یہ ملک صرف عوام کی ملکیت ہے۔ حکومت اگر محبِ وطن ہے تو فوری طور پر اسمبلیوں کے لئے انتخابات کرائے اور اقتدار منتخب نمائندوں کے سپرد کر دے۔

ان کو اب یہ احساس ہوگیا ہے کہ بھٹو حکومت نے پاکستانی قوم اور ملک کی کتنی بڑی خدمت کی ہے۔ دیہاتوں کو بڑے شہروں کے ساتھ پکی سڑکوں سے ملا دیا۔ گاؤں گاؤں قریہ قریہ بجلی، ٹیلی فون، ڈاک خانے، اسپتال اور اسکول قائم کر کے دیہاتوں کے پسماندہ عوام کو شہری برادری کے دوش بدوش کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ تعلیم عام کرنے کے لئے ہر ضلعی ہیڈ کوارٹر پر ایک ایک کالج قائم کر دیا۔ بلوچستان کے قبائلی عوام کو سرداری لعنت سے نجات دلا دی۔ ہاری کو زمیندار اور مزدور کو کارخانہ دار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے حقوق مانگنے کا حوصلہ دیا۔ طلبا کے لئے تعلیمی ضروریات کو ہمیشہ مقدم رکھا۔ سارے پاکستان کے ایسے ایسے مقامات پر جا کر دورے کئے جہاں عام حالات میں ضلعی ڈپٹی کمشنر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہ صرف اس لئے تھا کہ وہ عوامی قائد تھے اور زیادہ سے زیادہ عوام سے ملنے کی ان کی خواہش بڑھتی رہتی تھی۔

بلوچستان میں گدو تھرمل پاور اسٹیشن سے بجلی کی ترسیل قائدِ عوام کا عظیم کارنامہ ہے۔ بلوچستان کی سرزمین پر بجلی کے دیوزاد کھمبے جب تک ایستادہ ہیں۔ ہمارے گھروں کے بلب جب تک روشن ہیں، ہمارے دلوں میں بھٹو کی یاد بھی اسی طرح روشن رہے گی۔ جناب بھٹو نے ہمارے گھروں کو روشن کر کے دراصل ہمارے دل و دماغ پر اپنی یادوں کے دیپ جلا دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلوچستان یونیورسٹی، بولان میڈیکل کالج انجینئرنگ کالج، کیڈٹ کالج اور بلوچستان ہائی کورٹ کا قیام بھی بھٹو حکومت کے عظیم تحفے ہیں۔ جو صوبہ بلوچستان کو ملے ہیں اور جنہیں نظر انداز کرنا بلوچستان کی روایات اور نظریات کے سراسر منافی ہے۔

ہم قبائلی لوگ دیہاتوں میں رہنے کی وجہ سے تقاریب کے سلسلے میں دور دراز علاقوں میں جاتے رہتے ہیں۔ ہم جہاں بھی گئے، جناب بھٹو کی یاد میں وہاں کے لوگوں کو روتے اور تڑپتے دیکھا ہے۔ ان کے ہاتھ آسمان کی طرف بھٹو کی درازیٔ عمر اور رہائی کے لئے اٹھے ہوئے دیکھے ہیں۔ غریب مزدور اور کسان بڑی جرأت سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جب بھی انشاء اللہ موقع ملا، ہم ثابت کر دیں گے کہ بھٹو کو عوام سے اور عوام کو بھٹو سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ قومی اتحاد کے لئے ایسی صورتِ حال لمحۂ فکر بن سکتی ہے۔

کابینہ میں چند نام نہ دیکھ کر مایوسی ہوئی

قومی اتحاد کا واحد مقصد اقتدار پر قبضہ کرنا تھا

تنظیم بلوچستان کے صدر جناب محمد اکبر لودھانی نے کہا ہے کہ پاکستان قومی اتحاد کی بقیہ جماعتوں نے نئی کابینہ میں شرکت کر کے پاکستان کے عوام کے اس دعویٰ کی گویا تصدیق کر دی ہے کہ گذشتہ الیکشن کے خلاف قومی اتحاد کی ہنگامہ آرائی صرف اور صرف غیر قانونی طریقے سے اقتدار پر قبضہ حاصل کرنا تھا اور یہ اس طرح ممکن ہو سکتا تھا کہ جناب بھٹو کو اقتدار سے الگ کر کے چور دروازوں سے آکر کرسیوں پر قبضہ کر لیں۔ ان ہی جماعتوں کے گھر کے بھیدی نے تو یہ بات بھی ڈنکے کی چوٹ پر کہی تھی کہ اکتوبر کے مجوزہ الیکشن انہی لیڈروں نے جنرل ضیاء الحق سے منت سماجت کر کے ملتوی کروائے تھے۔ کیونکہ ان کو اب شدید طور پر یہ احساس ہو چکا تھا کہ جناب بھٹو اب بھی عوام کی اکثریت میں مقبول ہیں اور ان کی پارٹی ابھی تک پاکستان بھر کی سب سے بڑی اور مؤثر پارٹی ہے۔ بلکہ جناب بھٹو پر کی گئی زیادتیوں اور پیپلز پارٹی کے خلاف تعزیری کارروائیوں کے سبب پاکستانی عوام میں جناب بھٹو اور ان کی جماعت کی قدر و منزلت مزید بڑھ رہی ہے اور پیپلز پارٹی اب ایک بھرپور قوت بن کے ابھری ہے۔ اب نئی کابینہ کے حلف اٹھانے سے پہلے قومی اتحاد کے لیڈروں نے الیکشن میں چودہ ماہ کی تاخیر منظور کر لی ہے۔ تاکہ کچھ عرصہ تو اقتدار میں رہ کر اسلام آباد میں وزرا کی وسیع و عریض کوٹھیوں اور کاروں کے مزے لوٹ لیں۔ کیونکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اگر واقعی انتخابات غیر جانبدارانہ و آزادانہ منعقد کروائے گئے (جس کی موجودہ کابینہ سے امید نہیں کی جا سکتی) تو وہ پاکستان پیپلز پارٹی کے مقابلے میں کبھی نہیں جیت سکتے۔ اور نہ ہی کبھی اقتدار میں آکر دوبارہ ان لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

جناب محمد اکبر لودھانی نے کہا کہ نئی کابینہ میں ہمارے ”ملاجی“ اور ان کے ساتھیوں کے نام نہ دیکھ کر ہم ایک لمحہ کے لئے حیران رہ گئے کہ بچارے ”ملاجی“ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے

ہوئے ہم مفت میں بدنام ستم گر یا تیرے لئے

دراصل ”ملاجی“ کو اقتدار کی چاٹ ایسی لگی ہوتی تھی کہ وہ اپنا آقا تک بدلنے کو تیار ہو گیا۔ ہر تقریر و تحریر میں ”بھٹو چاند ہے ہم اس کی روشنی،

بھٹو سورج ہے، ہم اس کی کرنیں۔ بھٹو سمندر ہے، ہم اس کی لہریں، بھٹو پھول ہے ہم اس کی خوشبو“ وغیرہ کہنے والے ”ملاجی“ نے جب بھٹو صاحب کو اقتدار سے ہٹتے دیکھا تو دوبارہ ہوسِ اقتدار میں بے قرار ہو کر جھٹ سے اپنے پھول، چاند اور سورج سے الگ ہو گئے۔ اور جنرل صاحب سے اپنا ناطہ جوڑ لیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ پہلے بھی اپنے آقا بدلتے آئے ہیں۔

پاکستان کے عوام کو جس تیزی سے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی کمی کا احساس آج کل ہو رہا ہے شاید ہی ان کے اقتدار کے زمانے میں بھی ایسا ہوا ہو،

موجودہ کابینہ حکمران طبقوں کی ناکام کوششوں میں سے ایک ہے

تمام گرفتار شدہ صحافیوں کو رہا کیا جائے!

غیر ملکی سرمایہ قومی ملکیت میں لیا جائے

پاکستان سوشلسٹ پارٹی کا مطالبہ

پاکستان سوشلسٹ پارٹی سرحد کی صوبائی مجلس عاملہ کا ایک اجلاس ۸ ستمبر کو پارٹی کے نوجوان رہنما جناب لیاقت علی خٹک کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ اجلاس سے پارٹی کے صوبائی صدر عبدالرزاق خان ایڈووکیٹ (بنوں) سکریٹری جنرل عبدالوحید ایڈووکیٹ (پشاور) سکریٹری امورِ محنت نصیر احمد خان (پشاور) عمر فاروق میانخیل (ڈیرہ اسمٰعیل خان) طاہر نعمانی (ہزارہ) ظہور احمد (چارسدہ) لیاقت علی خٹک (نوشہرہ) اور وسیم جارج (پشاور) نے خطاب کیا۔

اجلاس نے مختلف عوامی علاقائی، قومی اور بین الاقوامی مسائل کا تفصیلی جائزہ لیا اور قرار دیا کہ پاکستان سوشلسٹ پارٹی نے اپنے قیام کے بعد سے مختلف مسائل کے حل کے لئے جو لائن وضع کی تھی اور عوامی و ملکی مسائل کا جو حل تجویز کیا تھا وہ اب تاریخی طور پر درست ثابت ہو رہا ہے۔

اجلاس میں کہا گیا کہ آج پاکستان اور اس کے عوام جن مسائل سے دوچار ہیں انہیں حل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان اپنی قومی آزادی کے استحکام اور علاقائی سالمیت کے تحفظ کے لئے فوری انقلابی اقدامات کرے۔ اور تمام سامراجی معاہدوں سے فوری طور پر علیحدگی اختیار کرے، تمام غیر ملکی قرضوں کی واپسی سے انکار کر دے اور پاکستان میں لگا ہوا تمام غیر ملکی سرمایہ قومی ملکیت میں لے لیا جائے۔ تمام زرعی اراضی خوانین، وڈیروں اور جاگیرداروں سے بلا معاوضہ قومی ملکیت میں لے کر گزارہ یونٹ اور خود کاشت کی بنیاد پر کسانوں میں تقسیم کر دے اور کاشت مشینی بنیاد پر کرنے کے لئے صنعتی منصوبہ بندی کی جائے اور زراعتی کوآپریٹو قائم کرے۔ صنعت، زراعت اور تجارت کو قومی مفادات کے مطابق استوار کیا جائے نہ کہ سامراجی اور مٹھی بھر مفاد پرستوں کے حق میں، پاکستان کے تمام صوبوں کو ان کے نمائندوں کے اطمینان کے مطابق مکمل خود مختاری دی جائے تعلیمی نظام کو نئے سرے سے سائنسی بنیادوں، قومی مفاد اور حب الوطنی کے تقاضوں کے مطابق استوار کیا جائے۔ تمام شہری جائیدادان کے مکینوں کے حوالے کر دی جائے اور ہر شہری کو روزگار کا حق دیا جائے، خواتین کو مردوں کے برابر حقوق دیئے جائیں، آزادیٔ اظہار و افکار کو قومی زندگی کا بنیادی اصول بنایا جائے۔

اجلاس نے قرار دیا کہ یہ تمام اقدامات صرف محنت کش عوام کی طاقت اور اقتدار حاصل کر لینے کے بعد ہی کئے جا سکیں گے۔ کیونکہ کوئی مفاد پرست ٹولہ ایسے اقدامات کرنے کی حمایت تو کیا کرے گا ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑا رہے گا۔ اجلاس نے صحافیوں کی جدوجہد کی حمایت کرتے ہوئے آزادیٔ اظہار پر تمام پابندیاں فوراً ختم کرنے اور تمام گرفتار شدہ صحافیوں اور ان کے حامیوں کی رہائی اور ان کے ساتھ تمام سیاسی اسیروں کو بھی رہا کرنے کا مطالبہ کیا۔

اجلاس میں کوڑوں کی سزا کی منسوخی، مارشل لاء عدالتوں کے خاتمے، فوری انتخابات، سیاسی سرگرمیوں کی مکمل آزادی، مزدوروں کی تنخواہیں کم از کم ایک ہزار روپے ماہوار مقرر کرنے، چھانیٹوں، تالہ بندیوں کسانوں کی بے دخلیوں پر مکمل پابندی عائد کرنے کرایہ داروں کے خلاف نئے قانون کی منسوخی کا مطالبہ کیا گیا۔ افغانستان کے انقلاب کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کے خلاف رجعت پسندوں کے مذموم پروپیگنڈے کی شدید مذمت کی گئی۔ پارٹی کے مرحوم رہنما سید مطلبی فرید آبادی کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ الفتح، معیار اور دوسرے ترقی پسند ادب کے خلاف انتظامیہ اور رجعت پسندوں کی مجنونانہ کارروائیوں کی شدید مذمت کی گئی۔ اجلاس بائیں بازو کی پارٹیوں کے محاذ "عوامی جمہوری اتحاد" کا خیر مقدم کرتے ہوئے تمام حقیقی سامراج دشمن جمہوریت پسند اور عوام دوست عناصر سے اس کے پروگرام تلے اکٹھا ہونے کی اپیل کی۔

اجلاس نے موجودہ کابینہ کو حکمران طبقوں کی ناکام کوششوں میں سے ایک اور ناکامی قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان میں اقتدار چور دروازہ سے ہی منتقل ہوتا رہا ہے اور اس حمام میں تمام بورژوا سیاسی جماعتیں ننگی ہو چکی ہیں اور عوام کا اعتماد کھو چکی ہیں۔

تمام مزدور متحد ہو جائیں

سندھ بائی وے مزدور پیپلز یونین کی اپیل

سندھ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ مزدور پیپلز یونین سکھر کے ڈپٹی جنرل سکریٹری جناب خورشید احمد اور پروپیگنڈہ سکریٹری جناب محمد چھٹل نے ایک پریس بیان میں کہا ہے کہ لاڑکانہ میں مزدوروں کی جدوجہد سندھ کے ظلم کی چکی میں پسے ہوئے مزدور طبقے کی اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد ہے اسے سرمایہ داروں یا نوکر شاہی کا کوئی دلال نہیں روک سکتا اور یہ مزید تیز تر ہوگی اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک مزدوروں کے مطالبات تسلیم نہیں کر لئے جاتے جناب خورشید احمد اور جناب محمد چھٹل نے سندھ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ کے مزدوروں سے اپیل کی ہے کہ وہ انجینئروں اور افسروں کے دلالوں مشتاق مہر، یعقوب اور امیر بخش چارج مین، ریاض چارج مین وغیرہ کے غلط اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کا منہ توڑ جواب دے کر یہ ثابت کریں کہ مزدور طبقہ ان مفاد پرست غداروں کو بے نقاب کر چکا ہے انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ ان ایجنٹوں کے خلاف سرکاری گاڑیوں کے ناجائز استعمال کرنے اور ہزاروں روپے کے ہیر پھیر کے خلاف تحقیقات عمل میں لائی جائے اور ملک کے مزدور طبقے سے اپیل کی ہے کہ وہ ہائی ویز ڈیپارٹمنٹ کے محنت کشوں کے ساتھ ساتھ الائیڈ ٹیکسٹائل ملز اور اس علاقے کے دیگر مزدوروں کے مطالبات کے لئے لاڑکانہ میں جاری جدوجہد کی مکمل حمایت کریں۔

"نوائے وقت" کا نمائندہ خصوصی اطلاع دیتا ہے (۱۳ ستمبر) کہ بہت سے اہم ملکوں میں سفیروں کی آسامیاں خالی پڑی ہیں۔ اس خبر سے کئی حلقوں میں کھلبلی مچ گئی ہوگی۔ جو لوگ اس راز کو سینے میں دبائے اس نعمت غیر مترقبہ کے لئے چپکے چپکے ہاتھ پاؤں مار رہے ہوں گے انہیں "نوائے وقت" پر بڑا تاؤ آیا ہوگا کہ کم بخت بنا بنایا کھیل بگاڑ رہا ہے، اور جن لوگوں کو اس مژدۂ جانفزا کی اب تک خبر نہ ہوگی وہ کمر کس رہے ہوں گے۔ انقلاب کا ایک نتیجہ مواقع کا حصول بھی نکلتا ہے جیسا کہ ۴۷ء میں وسیع ترین پیمانے پر ہوا تھا کہ جنہوں نے پاکستان کی موافقت میں انگلی تک نہ ہلائی تھی، سلطنت خداداد کے کرتا دھرتا بن بیٹھے اور جنہوں نے مخالفت میں دونوں ہاتھ اٹھائے (زمین کہاں سے لاتے!) وہ سر کے بل کھڑے ہو کر اپنے حصّے کے طلبگار ہوتے۔ بہر حال "نوائے وقت" کی اطلاع وزارت سے محروم رہ جانے والوں کے لئے گولڈن چانس ہے۔

محکمہ تحفظِ نباتات کے مشیر و ڈائرکٹر نے ایک حکمنامہ کے ذریعے ٹڈی دل کے خطرے کے پیشِ نظر ملازمین کو عید اور ہفتے کے روز کی سرکاری چھٹیاں نہیں دیں۔ (جسارت۔ ۱۳ ستمبر) اس محکمے کے افسرِ اعلیٰ خیر سے بڑے دور اندیش بلکہ عاقبت اندیش واقع ہوتے ہیں۔ کاش دیگر محکموں کے افسران اعلیٰ کو بھی یہی خوبی ودلیعت ہوتی! لیکن محکمہ نباتات کو ہی ٹڈی دل سے مقابلہ کرنے پر کیوں مامور کیا گیا ہے! ٹڈی دل سے اصل خطرہ تو اجناس کی کھڑی فصلوں، سبزی، ترکاریوں اور کچھ پھلوں کو ہوتا ہے اور یہ چیزیں غذائی پیداوار کے زمرے میں آتی ہیں لہٰذا محکمہ خوراک و زراعت کو ٹڈی مار اسلحہ یعنی چھڑکنے والی دواؤں سے لیس کیا جانا چاہیئے جن کے بارے میں محکمہ نباتات کے ملازمین الزام لگاتے ہیں کہ افسران یہ دوائیں بیچ کھاتے ہیں۔ اور چھڑکاؤ کے لئے پانی سپلائی کرتے ہیں۔ اس طرح محکمہ خوراک و زراعت والوں کو دہرا فائدہ ہوگا۔ دواؤں سے دام کھرے ہوں گے اور جب کھیتوں میں اناج نہ بچ سکے گا تو خفیہ گوداموں سے "بھتہ" ملے گا۔

پگڑی ادا کرنے والے کرایہ داروں کی ایکشن کمیٹی نے پگڑی کو قانونی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا ہے۔ ("جسارت ۱۳ ستمبر") پگڑی سے شہروں سے دور دراز علاقوں اور دیہات میں بسنے والے لوگ کوئی اور مطلب نہ نکال لیں اور سمجھیں کہ "پگڑی سنبھال جٹا" والی بات ہے۔ یا استادوں، پیروں، پیش اماموں، سجادوں اور سمدھیوں کو پگڑی باندھنے کا معاملہ ہے، اس لئے انہیں بتانا ضروری ہے کہ یہ متبرک اور بیش قیمت شئے صرف بڑے شہروں میں فروخت ہوتی ہے۔ لیکن ڈھکے چھپے اور اب اسے سرِعام بیچنے کا لائسنس طلب کیا جا رہا ہے۔ یوں بھی اصل تو وہ پگڑی بزرگی کی نشانی اور اسلامی ثقافت کی علامت ہے جسے پرانی وضع کے بزرگوں کے علاوہ جدید وضع کے طرم خاں بھی باندھتے ہیں۔ سکھوں کے ہاں تو اس کی باقاعدہ مذہبی حیثیت بھی ہے۔ لہٰذا کوئی مضائقہ نہیں کہ اگر اس پگڑی کے "احترام میں" اس اسلامی نظام کے دور میں، کرایہ داروں اور مالکان مکان کے مابین خفیہ طور سے بدلی جانے والی پگڑی کو قانونی حیثیت دی جائے کہ پگڑی بدل بھائی بننا محبت، اخوّت اور بھائی چارے کی بھی ایک رسم ہے۔

پگڑی کا تذکرہ آیا تو سالِ رواں میں منعقد ہونے والے ہائی کورٹوں کے ججوں کے اس آئندہ اجلاس میں اسے عدالتی لباس میں شامل کرنے پر ضرور غور کیا جائے، جس کا تذکرہ لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مولوی مشتاق حسین نے گذشتہ دنوں لاہور میں عدالتی سال کی تقریب میں کیا ہے۔ پرانی تصویروں میں اکابرین، شرفاء، دانشوروں، سرکاری حکام و عمال، ادیبوں، شاعروں اور منصفوں وغیرہ کو پگڑیوں میں دیکھ کر ایک خاص وجدانی کیفیت طاری ہوتی ہے خصوصًا جب جج صاحبان پگڑی باندھ کر عدالت کی کرسی پر بیٹھیں گے تو حاضرینِ عدالت، وکلاء، مدعی اور مدعا علیہ سب ہی لوگ ایک خاص تاثر سے ہمکنار ہوں گے جسے آپ جذبۂ روحانی کا نام دے لیجئے جسے اب تلاش کیا جا رہا ہے لیکن اس سلسلے میں فیصلہ کرنے سے پہلے ٹوپی کے طرفداروں کی رائے لینا بھی ضروری ہے کیونکہ موجودہ اکابرینِ ملت میں پگڑی والے اور ٹوپی والے دونوں برابر برابر شامل ہیں۔ کہیں پگڑی اور ٹوپی کی کشمکش عدالتی لباس کا فیصلہ کرنے والوں کی کھینچا تانی نہ شروع کر دے۔

مسلم لیگی رہنما جناب جلال الزّماں نے جناب اصغر خاں کو مشورہ دیا ہے کہ اگر انہیں سیاست سے وقت نکالنے کا موقعہ ملے تو وہ چند کتابیں تاریخ ہند و پاکستان کے بارے میں پڑھ ڈالیں۔ (جنگ ۱۳ ستمبر) قطع نظر اس کے کہ موصوف نے اس جملے سے اور بیان میں آگے چل کر ایئر مارشل (ریٹائرڈ) کی توہین کی ہے، یہ کہنا ضروری لگتا ہے کہ اماں ـــ کتابوں میں کیا رکھا ہے! اصل چیزیں تو انگلیاں اور زبان ہیں جو ہر رنگ ضرورت کے ساتھ رنگ بدلتی ہیں۔ کتابیں تو طاقوں میں رکھی رکھی بے رنگ ہو جاتی ہیں۔ یہ کتابوں کا نہیں زبان اور انگلیوں کا کرشمہ ہے جس سے ہوتا یہ ہے کہ ؎

اکبر کے کفر کا نہ رہا قدرداں کوئی
اُس بُت کو شیخ جی نے مسلمان کر لیا

اس کے علاوہ بقول آسکر وائلڈ، "مطالعہ

بڑی بڑی چیز ہے۔ اس سے لوگ مر جاتے ہیں"۔ کیا جناب جلال الزماں خدانخواستہ ایئر مارشل (ریٹائرڈ) کو مطالعہ کروا کر مارنا چاہتے ہیں؟

محکمہ انکم ٹیکس جس پر گذشتہ تیس برسوں سے انکم ٹیکس چوری کرنے والوں سے یارانہ رکھنے اور سرکاری خزانے کو لاکھوں روپے کا نقصان پہنچانے کا الزام لگایا جاتا رہا ہے اب بے حد فعال، مستعد اور دیانت دار بن گیا ہے۔ اس کا ثبوت محکمے کے اس نوٹس سے ملتا ہے جو اس نے صفِ اوّل کی ممثلہ زیبا کو بھیجا ہے کہ اگر انہوں نے انکم ٹیکس کے بقایا جات جو تقریباً پونے تین لاکھ روپے بنتے ہیں، ادا نہ کئے تو ان کی کوٹھی فروخت کر دی جائے گی (جنگ۔ ۴ ستمبر) افسوس کہ زیبا کے شوہر جناب محمد علی نے جو خود کو محبِ وطن کہتے ہیں، محکمے کی اس کارگذاری کو سراہنے کی بجائے الٹا اسے مطعون کیا ہے کہ انہوں نے تو انکم ٹیکس والوں کو پیشگی طور پر سات لاکھ روپے سے زائد رقم دی ہے۔ جناب محمد علی کو چاہیئے کہ وہ اپنی حب الوطنی کا محض زبانی نہیں بلکہ منہ بولتا ثبوت دیں اور فوراً مطلوبہ بقایا جات ادا کر دیں، اور وہ پیشگی ۷ لاکھ ۵ ہزار ۸۰ روپے جن کا وہ تذکرہ کر رہے ہیں، محکمے کی حسن کارکردگی پر اسے انعام سمجھ لیں۔

کراچی میں نہم اور دہم کے طلبا کے لئے اسلامیات کی نصابی کتاب ابھی تک فراہم نہیں کی گئی ہے۔ سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ حیدر آباد کی عدم توجہی سے طلبا پریشانی میں مبتلا ہیں (جنگ ۴ ستمبر) وزیر تعلیم جناب محمد علی خاں ہوتی کو فوراً اس سازش کی طرف توجہ دینی چاہیئے جس کا مقصد طلبا کو اسلامیات سے محروم رکھنا لگتا ہے اور جس میں یقیناً سابقہ حکومت کے حامی اور طرفدار عناصر کا ہاتھ ہوگا۔ وزیر موصوف کو سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ میں فوراً تطہیر کرنا چاہیئے لیکن..... چندے ٹھہر جائیں۔ صوبائی وزارتیں بھی جلد ہی کارخانے سے نکلنے والی ہیں جن میں سے "جنگ" کی پیش گوئی کے مطابق چھ مسلم لیگ، چار جماعت اسلامی، اور ایک ایک جمعیت علمائے اسلام اور پی ڈی پی کے حصے میں آئیں گی۔ ٹیکسٹ بورڈ کی تطہیر کا سہرا ان میں سے کسی کے سر بندھنے دیجئے۔

یادش بخیر۔ جناب ولی خاں ابھی سیاسی اکھاڑے میں موجود ہیں۔ ورنہ اتنے دنوں تک ان کا کوئی چٹکیلا، بھڑکیلا بیان نہ آنے پر خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ریٹائر ہونے کی بذلہ گوئی کو عملی جامہ پہنا رہے ہیں۔ بہرحال موصوف نے حسبِ روایت ایک چٹکیلا، بھڑکیلا بیان پشاور میں دیا ہے (جنگ ۱۵ ستمبر) جس میں حسبِ توفیق ایک بانسری سے کئی سُر نکلے ہیں جو ان کا ہی حصہ ہے۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی تعریف بھی اور ان کے اقدامات سے انحراف بھی۔ کہتے ہیں "ان لوگوں (قومی اتحاد) نے اسلامی نظام کو ایک کارتوس بنا رکھا ہے جسے وہ وقتاً فوقتاً چھوڑتے رہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ عملاً اسلامی نظام نافذ ہو تاکہ چوروں کے ہاتھ کاٹے جائیں"۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کارتوس چھوٹا ہی جا رہا ہے تو کیا یہ ایک متحرک عمل نہیں ہے؟ ساکن حالات میں الماری میں بند ہے؟ دوسری بات معلومات میں یہ اضافہ ہے کہ اسلامی نظام صرف چوروں کے ہاتھ کاٹنے کا نام ہے۔ خدا کرے جناب ولی خاں سیاست سے ریٹائر ہونے کے بعد ہی بتا دیں کہ وہ کیا کہنا اور کیا کرنا چاہتے تھے۔

سرکاری اہل کار سیمنٹ کی بلیک مارکیٹنگ کر رہے ہیں!

انجمن دوکانداران پرچون سیمنٹ فروشاں (رجسٹرڈ) فیصل آباد نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کو ۱۵ ممبروں کی دستخط کردہ عرض داشت پیش کی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ انجمن دوکانداران پرچون سیمنٹ فروشاں رجسٹرڈ فیصل آباد پنجاب کی سب سے بڑی انجمن ہے جس کے ممبران کی تعداد ۸۴ ہے اور اس کے زیر اہتمام پنجاب کی سب سے بڑی سیمنٹ ایجنسی ہے۔ سیمنٹ کی مقدار تقریباً ۳۸۰ من ماہوار ہے ہم چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی خدمت میں تلخ حقائق پر مبنی اپنی معروضات پیش کرتے ہیں کہ کس طرح ایک سرکاری ادارہ کے اہل کار اپنی بے قاعدگیوں اور بدعنوانیوں سے پنجاب میں سیمنٹ کی بلیک مارکیٹنگ اور مصنوعی قلت پیدا کر کے صارفین میں اضطراب اور بے چینی پیدا کر رہے ہیں اور ملک میں سیمنٹ کے بحران کو سنگین سے سنگین تر بنایا جا رہا ہے۔

۱۹۷۵ء میں پنجاب کے سولہ اضلاع اور تحصیل کی بنیاد پر رجسٹرڈ انجمنوں کو اسٹیٹ سیمنٹ کارپوریشن کی طرف سے سیمنٹ ایجنسیاں دی گئیں۔ تقریباً ۲۳ انجمنوں میں سے سولہ ایجنسیں غریب وال سیمنٹ لمیٹڈ سے منسلک کر دی گئیں ۱۹۷۵ء سے لے کر آج تک غریب وال سیمنٹ لمیٹڈ کی بے حس اور نااہل انتظامیہ نے انجمنوں کے سلسلے میں انتخاب کو تسلیم نہ کرنے کی خانہ ساز پالیسی اور غلط حکمت عملی اپنا رکھی ہے انتظامیہ کے اس ناروا طرز عمل سے انجمنوں میں شدید اضطراب پیدا ہو گیا ہے۔ بعض اہل کار انجمنوں کے خلفشار اور پھوٹ میں ملوث ہیں انجمن کا بیشتر سیمنٹ کا کوٹہ متعدد بار فیکٹری کے گیٹ پر بلیک میں فروخت ہو کر آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد کے شہروں میں استعمال ہوتا رہا اور فیصل آباد میں صارفین کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ انجمن کے عہدیداروں، اراکین مجلس عاملہ اور ممبروں کے پاس سیمنٹ کی بلیک مارکیٹنگ کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ ہم چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق صاحب سے استدعا کرتے ہیں کہ انجمن کی سیمنٹ ایجنسی ۱۹۷۴ء کے جملہ معاملات کی تحقیقات کرائیں ان شاء اللہ پنجاب میں سیمنٹ کی مصنوعی قلت پیدا کرنے کے سکینڈل کا انکشاف ہوگا

بقیہ :۔ ظفر قریشی

بنیادی حقوق کا تعلق ہے یہ اتنے بنیادی ہوتے ہیں کہ ان کو منسوخ کرنے کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔۔۔ آزادی تقریر، ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کی آزادی اور قانون مساوات ایسے معاملات نہیں کہ ان کے بنیادی ہونے کا اعلان کیا جانا ضروری ہو۔ ہم نے مختلف طریقوں سے ہمیشہ انہیں بحال رکھا ہے"۔

ایک اور موقع پر انہوں نے کہا کہ "ایک جج کا اور خصوصاً ایک چیف جسٹس کا تعلق قانون کی حکمرانی سے متعلق ہر چیز سے ہوتا ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ جب

وہ حکومت کے کسی فیصلے کو خلاف قانون قرار دے سکتا ہے ، اس وقت کچھ یوں نہیں کہہ سکتا کہ جب پورا آئین منسوخ کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک مختلف مسئلہ ہے کہ طاقت کے نظریے کو مدنظر رکھتے ہوئے عملی قانون دان یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کامیاب انقلاب بجائے خود ایک جواز ہوتا ہے لیکن جہاں تک ہمارا معاملہ ہے میں نے اپنے قانونی ضمیر کو آئین سے حلف اٹھا کر مطمئن کیا تھا اور ہر جج اپنے تقرر پر یہ حلف اٹھاتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس حلف وفاداری کے بعد میرا کیا فرض ہونا چاہیئے؟

جسٹس کیانی اپنا حلف آخر وقت تک نبھاتے رہے اور ساتھ ہی وہ پاکستان کی رائے عامہ کے بھی شاکی رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ عوام کو جو شخص چاہیے ریوڑ کی طرح ہانک دیتا ہے اور ہمارے ہاں کی ٹوٹے عامہ احتجاج تک نہیں کرتی۔ مجھے تو مضبوط رائے عامہ ایک سہانے خواب کی طرح دکھائی دیتی ہے۔"

ایک موقع پر جسٹس کیانی مرحوم نے اپنی تقریر میں پنجابیوں کو مخاطب کیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا "اے پنجابیو! انگریز نے تمہیں 'مارشل ریس' کا خطاب دیا تھا اور اب تم نے اس قوم کو مارشل لاء کا تحفہ دیا ہے۔"

کیانی مرحوم کی تمام تقاریر میں جگہ جگہ ایسی باتیں اور ایسے چٹکلے ملتے ہیں جو غاصبوں، آمروں اور طالع آزماؤں سے متعلق ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تقاریر کے چیدہ چیدہ اقتباسات اخبارات میں بطور اشتہارات چھپوائے جائیں سینماؤں میں ان کی سلائیڈیں دکھائی جائیں تاکہ عوام کو معلوم تو ہو کہ اس ملک میں صرف ابن الوقت اور کاسہ لیس ہی نہیں رہتے ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جو ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے کہتے مر جاتے ہیں لیکن اپنے اسی بے باک آزادی اظہار کے سبب ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

کیانی مرحوم آج زندہ ہوتے تو انہیں کم از کم آج کی رائے عامہ سے شکایت نہ ہوتی۔ لوگ کوڑے کھا رہے ہیں، جیل جا رہے ہیں، احتجاج کر رہے ہیں۔ تاریخ کا حصہ بن رہے ہیں۔

بقیہ : بے نظیر بھٹو

کے بخیے اُدھیڑ دیئے گئے۔ بغیر کسی وارننگ کے پولیس کے جیالے سپاہی اور آفیسر سرحد کی روایات کو پامال کرتے ہوئے پختونوں کے گھروں میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس بات کا انگریز نے بھی خیال رکھا تھا کہ وہ پختون کے گھر میں داخل نہیں ہوا۔ لیکن "مومنین" چادر اور چار دیواری کے تحفظ کے نعرے لگا کر کارکنوں کے گھروں میں داخل ہو گئے۔ پولیس نے گھروں میں گھس کر لواحقین کی توہین کی اور کارکنوں کو گرفتار کرتی رہی۔ اس طرح سترہ کارکن گرفتار کئے گئے۔ یہ کارکن جلوس میں قطعی شریک نہیں ہوتے تھے لیکن ان پر نعرے بازی اور جلوس کا الزام لگایا گیا، پھر کچھ کو رہا کر کے کچھ پر مقدمہ قائم ہوا اور بالآخر چھ میں سے تین کارکنوں کو سزا سنا دی گئی۔ شمس الدین کو ایک سال قید اور دس کوڑے، ڈاکٹر ناز درانی کو جو حال ہی میں ہری پور جیل سے رہا ہو کر آئے تھے، دوبارہ ایک سال قید اور ہمیش گل کو تین ماہ قید سخت کی سزا سنائی گئی۔ جب کہ خواجہ عبدالمالک نعت اور افضال کو رہا کر دیا گیا۔ اسی طرح تھانہ ہشت نگر میں آنسہ بے نظیر بھٹو، نصیر اللہ خان بابر، قمر عباس ایڈووکیٹ، حمید اللہ زاہد کے خلاف مارشل لاء کی دفعہ ۱۳ کے تحت مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ جب کہ مظفر شاہ ایڈووکیٹ اور امیر حیدر کے خلاف بھی مارشل لاء ۱۳ کی خلاف ورزی کے الزام میں مقدمہ درج ہے۔ تا حال ان میں سے کوئی بھی گرفتار نہیں ہو سکا۔ جب کہ ان کے گھروں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں، اور سرحد کے عوام سوچ رہے ہیں کہ جب کوئی دوسرا جلسہ کرتا ہے تو اُسے نہیں روکا جاتا اور جب عوام کوئی اجتماع کرتے ہیں، تو انہیں روکا جاتا ہے۔ یہ یک طرفہ کھیل آخر کب تک کھیلا جائے گا؟ لیکن یہ کھیل تو مسلسل کھیلا جا رہا ہے۔ بے نظیر جہاں جہاں بھی گئیں، وہاں کے لوگوں کو اس بات کی سزا دی جا رہی ہے کہ انہوں نے بھٹو کی بیٹی کا استقبال کیوں کیا؟

نوشہرہ میں ہونے والے جلسے میں نوشہرہ انڈسٹریل کے مزدوروں نے شرکت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ سرحد کے مزدور آمریت کا ساتھ نہ دینے کی روایت کو زندہ رکھے ہوتے ہیں اور اب بھی وہ ہمیشہ کی طرح دشوار گذار اور مشکل راستے کا انتخاب کر چکے ہیں لیکن جب بے نظیر یہاں سے گزر کر آگے بڑھیں، تو سرحد کی پولیس یہاں کے رہنماؤں کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئی۔ کئی رہنماؤں، کارکنوں اور مزدور لیڈروں کے گھروں پر چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ نوشہرہ پی پی پی کے صدر مظفر شاہ ایڈووکیٹ اور امیر حیدر سیکرٹری جنرل کے مارشل لاء آرڈر ۱۳ کے تحت وارنٹ جاری کئے جا چکے ہیں اور ان کی گرفتاری کے لئے اب تک ہر امکانی مقامات پر چھاپے مارے جا چکے ہیں۔ پشاور کی طرح یہاں بھی چادر اور چار دیواری کی دھجیاں "مومنین" کا مذاق اُڑا رہی ہیں۔

بے نظیر کے سرحد کے جلسوں میں پشاور اور ایبٹ آباد کے علاوہ ہاتھیاں کا جلسہ اس لئے اہم ہے کہ اس میں ہشت نگر کے تمام کسانوں نے بھرپور انداز میں شرکت کر کے اپنے مخصوص انداز میں نعرے لگا کر سامراج کی یا آخر مرت کا اعلان کیا۔ ہاتھیاں کے صدر اور روشن خیال رہنما رحیم داد نے اعلان کیا کہ پختون نے کبھی ظلم کے آگے سر نہیں جھکایا اور اب بھی وہ ہر تشدد کا اسی طرح مقابلہ کریں گے جس طرح کہ پختون کی تاریخ سنہری لفظوں میں درج ہے۔

بے نظیر کا دورۂ سرحد، سرحد میں ایک طرف تو پی پی پی کی جڑیں مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہوگا تو دوسری طرف پی پی پی کے کارکنوں میں یہ احساس پیدا کرنے کا سبب بنے گا کہ اب بھی انہیں ایک مضبوط اور فعال قیادت حاصل ہے۔

بے نظیر کا دورۂ سرحد کئی لحاظ سے دور رس سیاسی تبدیلیوں کا سبب بھی ثابت ہوگا۔ سرحد میں اب تک نیپ کی سامراج دشمنی اور صوبائی حقوق کی جنگ کے حوالے سے سیاست کی پہچان تھی۔ این ڈی پی کی مارشل لاء دوستی نے سرحد کی سیاست میں اُن کی جڑیں ہلا کر رکھ دی تھیں۔ اب بھی اگر این ڈی پی کو سرحد میں زندہ رہنا ہے، تو اپنے اصل کردار کی طرف لوٹ کر آنا ہوگا، ورنہ پی پی پی کا زوردار سیلاب مارشل لاء کی حامی سیاست کی چھوٹی چھوٹی جڑی بوٹیوں کے ساتھ این ڈی پی کے تناور درخت کو بھی بہالے جائے گا۔ بے نظیر کا کامیاب دورۂ سرحد نہ صرف مارشل لاء کی تشدد پر آمادہ حکومت کے لئے بلکہ تمام اس کی حامی جماعتوں کے لئے بھی ایک الارم ہے۔ اور جو الارم کو سن کر اپنے کان بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔

بقیہ: ٹنڈو الہ یار

محمد علیمی فاروقی کی پریس کلب میں پریس کانفرنس تھی۔ مولوی صاحب مقررہ وقت پریس کلب پہنچے۔ انہوں نے اپنے بیان کی کاپیاں صحافیوں میں تقسیم کیں۔ انہوں نے اپنا تحریری بیان پڑھنا ہی شروع کیا تھا کہ سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس والا دندناتا ہوا اندر گھس آیا اور ایک سینئر صحافی سے بڑی بداخلاقی کے ساتھ پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ صحافی نے جواب دیا کہ یہ پریس کانفرنس ہے جواب سننے کے بعد اس پولیس والے نے کہا کہ ہمیں بھی اسکی ایک کاپی چاہیئے۔ ایک دوسرے صحافی نے کہا کہ آپ اس کی کاپی مولوی صاحب سے حاصل کرلیں قومی اتحاد کے مقامی صدر مولوی محمد علیمی فاروقی جو پریس کانفرنس سے خطاب کر رہے تھے اپنا بیان روک کے پولیس والے سے کہا کہ میں اپنے بیان کی ایک کاپی سی آئی ڈی والوں کو دے چکا ہوں اور اگر آپ کو دوسری کاپی چاہیئے تو میں بعد میں آپ کو دے دوں گا۔ فی الوقت تم یہاں سے چلے جاؤ، وہ صاحب بمشکل تمام یہاں سے رخصت ہوئے۔ باہر انہوں نے اپنا محاصرہ بدستور جاری رکھا پریس کلب میں موجود تمام صحافی یہ سوچنے لگے کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے اور یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے کیا، مقامی پولیس مقامی صحافیوں کو اشتعال دلاکر کسی قسم کی کوئی غیر قانونی کارروائی کرنے پر اکسا رہی ہے۔ اگر یہ بھی نہیں تو پھر ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مولوی محمد علیمی فاروقی تو قومی اتحاد کے صدر ہیں اس پریس کانفرنس سے تو وہی خطاب کر رہے تھے۔ یقینی بات ہے کہ وہ حکومت کے خلاف تو ایک لفظ بھی نہیں کہیں گے کیونکہ قومی اتحاد خود حکومت میں شامل ہے اور پھر اسی پریس کانفرنس کے دوران ان ڈنڈہ برداروں کا ہجوم کلب کے قریب کیوں جمع ہے ابھی تک یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ پولیس نے کن وجوہات کی بناء پر یہ حرکت کی۔

قومی اتحاد کے مقامی صدر جناب مولوی محمد علیمی، فاروقی نے مقامی انتظامیہ کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مقامی انتظامیہ عوام کے مسائل حل کرنے کی بجائے مسائل کو پیدا کرکے عوام میں بے چینی پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے۔

مجھے عام انتخابات دور دور تک نظر نہیں آتے

بقیہ: فضل الٰہی

حکومت سے مفاہمت نہ ہو سکی اور وہ ۵ جولائی کو ہی اپنے عہدے سے سبکدوش ہو جانا چاہتے تھے۔ اگر انہیں مفاہمت کا ذرا سا بھی امکان نظر آتا تو یہ عہدہ نہ چھوڑتے لیکن جلد انتخابات کی یقین دہانی اور پھر اس کے ملتوی ہوتے کے بعد وہ اس انتظار میں رہے کہ مارشل لاء حکومت کی طرف سے انتخابات کے بارے میں کوئی حتمی اعلان کیا جائے گا اور انتخابات کی تاریخ مقرر کی جائے گی لیکن بقول ان کے اب انتخابات کی دور دور تک کوئی امید نظر نہیں آتی ہے۔

سابق صدر نے بتایا کہ انتخابات کے بارے میں غیر یقینی صورت حال انہیں پریشان کئے دے رہی تھی اس لئے انہوں نے اس عہدے پر مزید متمکن رہنا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے کہا کہ شائد یہ صورت حال ان کے نزدیک قابل قبول بھی ہو جاتی لیکن چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی طرف سے آئین میں ترمیم کی باتیں ہونے لگیں۔ سابق صدر کہتے ہیں کہ میں عوام کے منتخب نمائندوں کے بنائے ہوئے آئین میں ترمیم کی منظوری کس طرح دیتا، خصوصاً جداگانہ انتخاب کے بارے میں ترمیم سے متفق ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ معاملہ طے ہو چکا تھا اور اس سلسلے میں آئین سے انحراف کسی طرح مناسب نہ تھا۔ میں نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے کہہ دیا تھا کہ طے شدہ معاملات کو دوبارہ اٹھا یا نہ جائے ورنہ صورت حال قابو سے باہر ہو جائے گی"۔

جناب فضل الٰہی چوہدری نے کہا کہ مارشل لاء حکام کے کہنے کے مطابق آئین معطل ہے۔ اس کی منسوخی یا موجودگی کے بارے میں کوئی فیصلہ صرف عدالت عالیہ ہی کرسکتی ہے جس نے "نظریۂ ضرورت" کے تحت آئین میں ترمیم کا اختیار بھی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو دیا ہے سابق صدر نے سوال کیا کہ کیا آئین اس تبدیلی کے بعد بھی موجود ہے؟ اور کیا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا یہ اقدام آئین کی اساس سے قطعی مختلف نہیں ہے؟ انہوں نے کہا کہ مارشل لاء حکام کے کہنے کے مطابق یہ اقدام آئین سے ماوراء اقدام ہے جس کی سپریم کورٹ نے انہیں "نظریۂ ضرورت" کے مطابق اجازت دے رکھی ہے۔

اپنی صحت کے بارے میں جناب فضل الٰہی چوہدری نے مسکراتے ہوئے کہا کہ بفضلِ الٰہی میں پوری طرح صحت مند ہوں اور ابھی حال ہی میں ہوانا کے دورے سے واپس آیا ہوں، اپنے مستقبل کے بارے میں انہوں نے کسی تردد کا اظہار نہیں کیا اور طنز سے کہا کہ وہ لاہور میں اپنے ذاتی مکان میں مستقل سکونت رکھنے کے خواہشمند ہیں جو بقول ان کے جیل روڈ پر جیل کے عین سامنے ہے۔ اسے وہ بنک والوں سے خالی کرا رہے ہیں اور اس کے خالی ہونے تک کسی اور مکان میں رہیں گے۔ لاہور میں سکونت سے قبل وہ کچھ عرصے کراچی میں اپنے صاحبزادے عطاء الٰہی چوہدری کے پاس مقیم رہیں گے جو یہاں ملازم ہیں۔

جناب فضل الٰہی چوہدری نے لاہور میں سکونت کی "خواہش" ظاہر کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں اس بارے میں فیصلے کرنے میں کسی رکاوٹ کا خدشہ ہے اور پھر ان کا جیل کی طرف مزاحاً اشارہ بھی خدا کرے مزاح ہی ہو۔

بھٹو دور کے صدر نے یہ بھی کہا ہے کہ انہوں نے اپنے فرائض بطریق احسن انجام دینے کی کوشش کی ہے اور ان کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ عوام ہی کر سکتے ہیں۔ ان کی اس بات سے مترشح ہے کہ وہ سابق وزیراعظم کی اس بھیانک تصویر سے چنداں مطمئن اور خوش نہیں ہیں جس کی نمائش کی جارہی ہے انہوں نے ملک کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے اقدامات کو عوام کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے اور یہ بات ان کے عوام پر غیر متزلزل اعتماد کی سمت میں اشارہ کرتی ہے۔

واضح رہے کہ جناب فضل الٰہی چوہدری پارلیمانی نظام کے تحت منتخب ہونے والے پہلے صدر مملکت ہیں جو عوام کی منتخب کردہ حکومت کی مقننہ کے بنائے ہوئے آئین کے تحت اپنی معیاد صدارت پوری کر کے اپنے طور پر سبکدوش ہوئے ہیں اور وہ پاکستان کے پانچویں صدر مملکت تھے۔ انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے رکن اور صدارتی پینل کے سربراہ کی حیثیت سے ۱۹۷۳ء کا آئین مرتب کرنے میں بھرپور حصہ لیا۔ اس سے قبل وہ ایوب خان کے دور میں قومی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر اور پھر سینئر ڈپٹی اسپیکر رہے اور مغربی پاکستان اسمبلی کے پہلے صدر بھی منتخب ہوئے تھے۔ البتہ ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کو آئین کی جزوی معطلی کے بعد وہ بامر مجبوری صدر رہے۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں قومی اسمبلی کے اسپیکر تھے۔

بقیہ : اندرونِ سندھ

پیر پگاڑا کے مرید خدا بخش نظامانی کے پاس ہے۔ ٹھیکہ کی شرائط کے مطابق ٹھیکہ دار کو ٹھیکے کی رقم کی قسط ہر ماہ مقررہ تاریخ پر ادا کرنا چاہئیے۔ نظامانی چونکہ مسلم لیگ کے بڑوں میں ہیں۔ قسطوں کی ادائیگی میں رعایت کے لئے اوپر سے سفارش لے کر آئے۔ ان کی اس سفارش کے نتیجے میں میونسپل کمیٹی کے پاس اپنے ملازمین کی تنخواہیں عید سے قبل ادا کرنے کے لئے فنڈ نہ رہا۔ میونسپل کے حکام تو پھر بھی سکوت اختیار کرتے۔ لیکن ملازمین نے تنخواہ ادا نہ ہونے کی صورت میں ہڑتال کی دھمکی دیدی۔ اب کیا ہوتا حکام کے لئے یہ تو ممکن نہیں تھا کہ سفارش کو نہ جانتے دوسری طرف ملازمین کی ہڑتال بھی سنگین، مسئلہ پیدا کر دیتی۔ انہوں نے ملازمین اور نظامانی ہر دو کی منت سماجت کی۔ دونوں ہی اپنی جگہ اٹل رہے ڈپٹی کمشنر درمیان میں پڑے، شہر کے ہر بڑے سے امداد طلب کی۔ چندہ کر کے ملازمین کو تنخواہیں ادا کیں مسئلہ فی الحال تو حل ہو گیا۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ "سر سلامت تو جوتے ہزار" کچھ یہی صورت حال اب بھی قائم ہے۔ حکمران سیاسی جماعتیں اور اس کے چودہری موجود ہیں۔ تو ہر دن ایسے کتنے ہی مسائل اٹھیں گے۔

بقیہ : بھارت

زبردست تباہی پھیلی۔ گنگا، جمنا، اور برہم پترا میں بارشوں اور سیلاب کی وجہ سے شدید طغیانی رہی۔ اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ صوبہ کے ۵۰ سے ۵۶ اضلاع مکمل طور پر تباہ ہوگئے ۴۰۰ کے قریب افراد ہلاک ہوئے، تقریباً ۲ بلین کی مالیت کی املاک اور فصلیں تباہ ہوگئیں۔ ۲۰ ہزار مکانات مسمار ہوگئے یا انہیں نقصان پہنچا، ۵۰۰ دیہات کے کم وبیش ۸ لاکھ افراد سیلاب سے متاثر ہوئے۔ ۶ ستمبر کی اطلاع تھی کہ تاج محل کے شہر آگرہ اور متھرا کو سیلاب سے زبردست خطرہ ہے۔ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ نے بتایا کہ مدنا پور کے اضلاع ہگلی اور بنکورا کو اپنی تاریخ کی بھیانک ترین تباہی کا سامنا کرنا پڑا۔ دو لاکھ افراد کو فوری طور پر ہر قسم کی امداد کی ضرورت ہے۔ اموات کے صحیح اعداد و شمار کا پتا نہیں چل سکا۔ ایک اخباری اطلاع کے مطابق سیلاب سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۱۵ ہزار ہے۔

ہماچل پردیش میں بھی غیر معمولی نقصانات ہوئے جس کا اندازہ اس بات کا لگایا جا سکتا ہے کہ ریاستی حکومت نے مرکز سے متاثرہ افراد کی آبادکاری کے لئے ۴۰ ملین طلب کیا ہے۔ بہار کے وسیع علاقے ہفتوں زیرآب رہے ہیں اور صوبائی دارالحکومت پٹنہ تباہی کے عظیم سانحہ سے دوچار ہے۔ ۱۵۰ افراد کے ہلاک ہونے کی اطلاع ملی ہے ہیضہ سے ۵۳ اموات ہو چکی ہیں، فصلوں کی تباہی کا تخمینہ ۳۰۰ ملین لگایا گیا ہے۔

یہ تو سیلاب کے ہاتھوں بھارت کی تباہی اور نقصانات کا ایک سرسری جائزہ ہے اور اب کچھ سیاسی حالات کا بھی ذکر ہو جائے جو سیلاب ہی کی طرح منہ کھولے بھارت کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

پندرہ، ایک ماہ قبل تک بھارت کے اخبارات میں وزیراعظم مرار جی ڈیسائی کے لڑکے کانتی کے بارے میں، سرخیوں سے خبریں چھپتی تھیں کہ اپنی بزنس کے جال کے پھیلانے کے لئے اپنے والد کے عہدے اور اختیارات سے کس طرح ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ابھی ان خبروں کی سنسنی خیزی اور حیرت انگیز انکشافات سے بھارت کے عوام پوری طرح لطف اندوز بھی نہیں ہو پائے تھے کہ اچانک اخبارات کی ہیڈ لائینوں میں وزیر دفاع جگ جیون رام کا لڑکا سریش کمار بڑی خبر بن گیا جسے دہلی کے مبصرین "گاربیج پالیٹکس" کا نام دیتے ہیں ۴۰ سالہ سریش کمار حال ہی میں بہار اسمبلی میں رکن منتخب ہوا ہے۔ عموماً وہ عوامی منظر سے دور رہتا ہے۔ لیکن عوام اور اُس کے درمیان یہ پردہ اس وقت ختم ہو گیا جب اس کے ساتھ اس کی ۱۸ سالہ گرل فرینڈ کو پرانی دہلی کے قریب اغواء کر کے دیہی علاقے کے ایک مکان میں قید کر لیا گیا۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ فحش اور غیر اخلاقی تصاویر بنوائیں اور ذلت آمیز اعترافات پر دستخط کریں۔ جونہی اس جوڑے کو چھوڑا گیا، سریش اور اس کی گرل فرینڈ سشما جو یونیورسٹی کی طالبہ ہے سیدھے پولیس اسٹیشن پہنچ گئے اور اغواء اور اس کے ساتھ ہونیوالے شرمناک واقعہ کی رپورٹ درج کرائی۔ رپورٹ میں سابق وزیر خارجہ چرن سنگھ اور اس کے حمایتیوں پر الزام لگایا کہ اس اغواء اور انسانیت سوز حرکت کے اصل ملزم وہی ہیں جب انہیں زبردستی لے جایا جا رہا تھا تو سیاسی ٹھگوں نے کہا کہ "تمہارے باپ نے چودہری چرن سنگھ کی ہمیشہ مخالفت کی" اس واقعہ کے سلسلے میں جن دو افراد کو گرفتار کیا گیا ان کا تعلق چرن سنگھ گروپ سے بتایا جاتا ہے۔

دہلی کے سریش اور سشما کی تصاویر کی کاپیاں بڑے منظم طریقہ پر تقسیم کی گئیں۔ اندرون خانہ رازوں اور سیاسی رقابتوں سے قریبی تعلق رکھنے والے مبصرین اس واقعہ کا محرک ڈیسائی، چرن سنگھ اور جگجیون رام کے درمیان سیاسی چپقلش قرار دے رہے ہیں۔ اغواء کی اسکیم تیار کرنیوالے قبول عام اس تھیوری پر عمل پیرا ہیں جس کے تحت یہ سمجھا جاتا ہے کہ کانتی کے اسکینڈل سے مرار جی ڈیسائی کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے اگر جگجیون رام بھی اس گندگی میں لت پت ہو جاتے تو جنتا پارٹی کی قیادت پر چرن سنگھ آسانی سے قبضہ جمالیتے ہیں اس شبہ کو اس بات سے بھی تقویت ملتی ہے کہ چرن سنگھ کے دائیں بازو کے سابق وزیر محنت، راجہ نرائن نے ایک پریس کانفرنس میں سریش کمار کے واقعہ پر نمک مرچ لگا کر باتیں کیں انھوں نے تصاویر دیکھنے کا، انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ بعض تصاویر تو اس قدر شرمناک ہیں کہ سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ انہوں نے سریش پر الزام لگایا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اور لمبے عرصے سے اس لڑکی کے ساتھ افیئر زچلا رہا ہے انہوں نے اعلان کیا کہ وزراء کے ساتھ رہنے والے ان کے، لڑکوں کو لوگوں سے مناسب سلوک کی ذمہ داری قبول کرنی چاہئیے۔"

راجہ نرائن کے اس ریمارک سے اس واقعہ کی تہہ میں کام کرنے والے محرکات کا حقیقی رنگ واضح طور پر محسوس کیا جا رہا ہے مبصرین کا کہنا ہے کہ اس واقعہ سے جگجیون رام کا سیاسی کیریئر زیادہ متاثر نہ ہوگا۔

جہاں تک کانتی ڈیسائی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ اس نے اپنے والد کا گھر چھوڑ دیا ہے اور بمبئی میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں بھی جب اسی قسم کا ایک اسکینڈل گرم ہوا تو ڈیسائی نے لوگوں کے مشتعل جذبات ٹھنڈا کرنے کا یہی نسخہ استعمال کیا تھا۔ کانتی نے اپنا سامان باندھا اور بمبئی میں رہائش اختیار کی

بقیہ : ایران

کے بعد وہ پارلیمنٹ کی کارروائیوں سے اپنے چالیس ارکان کو غیر حاضر رکھنے لگے اور کاموں میں رکاوٹ پڑ گئی شہنشاہ کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ روس اس وقت کے وزیراعظم کو پسند نہیں کرتا تھا۔ جب نومبر ۱۹۵۰ء میں ایران نے ۴۰ ملین پونڈ روسی قرضہ لیا تو اس کے بعد ڈاکٹر مصدق نے تیل کو قومیانے کی تحریک شروع کر دی اور مظاہروں کے دوران وزیراعظم رزم آرا کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے بعد شہنشاہ نے حسین علاء اور پھر ڈاکٹر مصدق کو وزیراعظم مقرر کیا۔ انہوں نے جون ۱۹۵۰ء کو مطالبہ کیا کہ انہیں چھ ماہ تک پارلیمنٹ

کی منظوری کے بغیر حکومت چلانے کی اجازت دی جائے اور وزارتِ جنگ بھی ان کے حوالے کی جائے۔ یہ شرط مانی نہیں گئی اور انہوں نے ۱۷ رجولائی کو استعفیٰ دے دیا ۲۲ رجولائی ۱۹۵۲ء کو احمد قوام کی چار روزہ وزارت کے بعد مجبوراً ڈاکٹر مصدق کو وزیراعظم بنانا پڑا۔ انہوں نے پریس پر پابندیاں عائد کیں، ایڈیٹروں کو گرفتار کر لیا، پارلیمنٹ میں مخالفین کو ہراساں کیا، افراطِ زر پیدا کردہ، کلیدی آسامیوں پر کمیونسٹ فوجی کمانڈروں کو متعین کیا، مارشل لا میں توسیع کرتے رہے، سپریم کورٹ کو معطل کر دیا، پارلیمنٹ کے انتخابات روک دیئے وغیرہ وغیرہ۔ فروری ۱۹۵۳ء میں انہوں نے شہنشاہ کو ملک سے باہر جانے کا مشورہ دیا اور اسے خفیہ رکھنے کو کہا۔ شہنشاہ نے ان کی بات نہ مانی اور ۱۳ راگست ۱۹۵۳ء کو انہیں برطرف کر دیا اور جنرل زاہدی کو ان کی جگہ مقرر کیا۔ ڈاکٹر مصدق کی حامی فوج نے وفادار فوج اور نہتے عوام پر گولیاں چلائیں شہنشاہ نے عوام کو فیصلہ کرنے کا موقعہ دینے کے لئے ملکہ کے ساتھ ملک سے باہر جانا ضروری سمجھا اور جب وفادار فوج نے ڈاکٹر مصدق کو گرفتار کر لیا اور جنرل زاہدی نے ملک پر پورا کنٹرول حاصل کر لیا تو شہنشاہ واپس آ گئے۔

یہ ہے شہنشاہ ایران کے الفاظ میں ڈاکٹر مصدق کے ہاتھوں اپنی ہزیمت، اقتدار سے محرومی اور اس پر دوبارہ قبضے کی مختصر رُوداد۔ اسے بیان کرتے ہوئے جہاں انہوں نے برطانیہ اور روس کی مفاد پرستی، مداخلت اور ان کے ہاتھوں ایران کی معیشت کی تباہی کا ذکر کیا اور یہ بھی کہا کہ روس نے ایران میں اشتراکی رجحانات رکھنے والی سیاسی جماعتوں اور ٹریڈ یونینوں کی بھرپور امداد کی جس سے تودہ پارٹی خطرناک حیثیت اختیار کر گئی۔ وہاں شہنشاہ نے امریکی رویئے کی تعریف کی ہے۔ کہتے ہیں کہ امریکہ نے ایران کی زوال پذیر معیشت کو سہارا دینا شروع کیا۔ غذائی اجناس فراہم کیں اور ایرانی کارکن امریکہ کے فوج، پولیس، زراعت، صحت اور مالی امور کے ماہرین سے تربیت لینے گئے۔

اب شہنشاہ کے سب سے بڑے اور طاقتور مخالف جناب آیۃ اللہ آقائے خمینی کے شہنشاہ پر عائد کردہ الزامات بھی دیکھئے جو انہوں نے فرانس کے روزنامہ "لی ماندے" کو انٹرویو دیتے ہوئے لگائے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ امریکہ نے ۱۹۵۳ء میں ڈاکٹر مصدق کے خلاف فوجی انقلاب برپا کر کے شاہ ایران کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا اور اس نے اب تک اپنا انداز نہیں بدلا ہے۔ چنانچہ جب تک وہ اپنے انداز پر قائم ہے، ہماری جنگ جاری رہے گی۔ مجھے (جمی کارٹر کے) انسانی حقوق کے منشور پر کوئی یقین نہیں ہے مثلاً جمی کارٹر ایران آئے اور شاہ کو اپنی مکمل حمایت اور تعاون کا یقین دلایا۔ حالیہ برسوں میں ہی امریکہ کا ایران کی جانب جھکاؤ کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے جناب آقائے خمینی جہاں شہنشاہ پر سامراجی پالیسیوں پر گامزن ہونے کا الزام لگاتے ہیں، وہاں یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ انہیں تخت سے اتارنے کے لئے کسی قیمت پر کمیونسٹوں سے تعاون اور اتحاد نہیں کریں گے تاہم ان کے (علماء) دورِ اقتدار میں کمیونسٹوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا پورا حق ملے گا۔ جناب آقائے خمینی کی اس بات سے یہ مطلب نکالا جا سکتا ہے کہ ایران میں شہنشاہیت کے مجوزہ خاتمے کے بعد تودہ پارٹی پر سے پابندی اٹھا لی جائے گی۔ جو کمیونسٹ پارٹی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کمیونسٹ پارٹی کا دوبارہ احیا ہو۔

موجودہ وزیراعظم جناب جعفر شریف امامی نے (جو سینیٹ کے صدر تھے اور جنہیں وزیراعظم جمشید آموزگار کے مستعفی ہونے کے بعد وزارتِ عظمٰی کا قلمدان سونپا گیا) مصالحت کی راہ اختیار کی اور فوری طور پر جناب آقائے شریعت مدار سے مذاکرات کی پیش کش کی جسے انہوں نے ٹھکرا دیا۔ جناب شریف امامی نے اسلامی احکام کے احترام، شاہی کیلنڈر کی جگہ اسلامی کیلنڈر کے اجراء، مذہبی معاشرے کے قیام، آزادانہ انتخابات، باقاعدہ سیاسی جماعتوں کو آزادانہ سرگرمیوں کی اجازت اور طلبہ کے مسائل پر خصوصی توجہ دینے کا اعلان کیا اور چند فوری جزوی اقدامات بھی کئے۔ اس کے باوجود ملک بھر میں عوام کی پولیس اور فوج سے خونریز جھڑپیں، ان پر بے پناہ فائرنگ، آتش زنی، املاک کی تباہی اور لاتعداد گرفتاریوں کی وارداتیں شدت سے جاری ہیں۔ ہزاروں افراد زخمی اور ہلاک ہو چکے ہیں۔ حتیٰ کہ ۸ ر ستمبر ۱۹۷۸ء کو تہران اور دوسرے گیارہ شہروں میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اس اقدام کے بعد بھی صورتِ حال حکومتی فوج کے قابو میں نہیں ہے۔ عوام کا فوج سے خونی تصادم اسی شدومد سے ہو رہا ہے۔ مظاہرے اسی جوش و خروش سے جاری ہیں۔ گرفتار ہونے والوں میں مذہبی راہنما جناب آیۃ اللہ نوری کے علاوہ بہت سے سابق وزراء، اعلیٰ افسر اور سیاسی رہنما کارکن شامل ہیں۔ ہلاک شدگان اور زخمی ہونے والوں کی صحیح تعداد کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اسی لئے یہ سوال رہ رہ کر ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا ایران میں ۵۳ء کی تاریخ پھر دہرائی جائے گی اور اب کے شہنشاہیت کا خاتمہ ہو جائے گا، یا شہنشاہ پھر اپنے مضبوط اعصاب، اپنے طویل سیاسی تجربے اور بیرونِ ممالک دوستوں کی مدد سے اپنی بادشاہت قائم رکھنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

اس ضمن میں بعض بین الاقوامی حلقوں میں جمہوریہ چین کے چیئرمین ہوا کو فنگ اور پاکستان کے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب ضیاء الحق کے ایران کے حالیہ دورے کو، اور شہنشاہ ایران کے نام امریکہ کے صدر کارٹر کے پیغام کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ یہ پیغام جس کے مندرجات صیغہ راز میں ہیں، واشنگٹن میں ایرانی سفیر اردشیر زاہدی ۸ ر ستمبر کو اچانک لیکر تہران پہنچے تھے۔ ایک انگریزی روزنامہ (ہیرالڈ ٹریبیون انٹرنیشنل) کے تبصرے کے بین السطور ایران کے حالیہ معاملے میں امریکہ اور چین کے طرزِ عمل میں مماثلت نظر آتی ہے اخبار مذکور نے شہنشاہِ ایران کی حکومت کو روس کی جانب پیش قدمی کے خلاف آخری رکاوٹ قرار دیا ہے کیونکہ خلیج فارس اور بحیرۂ ہند کی جانب روس کے بڑھتے ہوئے قدموں کی مزاحمت صرف شہنشاہ ایران کی حکومت سے ہی متوقع ہے اور یہی بات چیئرمین ہوا کو فنگ کے پیشِ نظر ہے جو رومانیہ اور یوگوسلاویہ میں روس کیخلاف مزاحمت کی حوصلہ افزائی کرنے کے بعد ایران پہنچے، اور شہنشاہ کی حکومت کے باوجود کو اس خطے کے لئے ناگزیر گردانا ہے۔

امریکی جریدے "نیوز ویک" (شمارہ ۱۸ ر ستمبر) کے مطابق امریکی حکام کو جو بات تشویش میں مبتلا کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ شہنشاہ چاروں طرف سے اپنے مخالفوں سے پس رہے ہیں اور طاقت کے استعمال کے لئے ان کے پاس گنجائش کم رہ گئی ہے۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی لیکن کوئی اقدام کام نہیں آ رہا ہے۔ اسی جریدے کی رپورٹ کے مطابق امریکہ کے ڈپٹی سیکریٹری آف اسٹیٹ وارن کرسٹوفر نے، جو سائرس وانس کی کیمپ ڈیوڈ میں مصروفیت کے باعث محکمے کے انچارج ہیں، واشنگٹن میں ایک "ایران ورکنگ گروپ" قائم کیا ہے جو اس بات کا سگنل ہے کہ حالات بحرانی صورت اختیار کر گئے ہیں۔ جریدے کے مطابق امریکی حکام نے ایران میں مقیم ۴۰ ہزار امریکیوں کو متنبہ کیا ہے کہ حالات بے حد خراب ہیں (Things are very very bad) بیشتر سفارتی حلقوں کو یقین ہے کہ فوج شہنشاہ سے وفادار رہے گی اور وہ فوج کی مدد سے

بغاوت پر قابو پالیں گے لیکن بعض ایرانی مبصرین کا کہنا ہے کہ آخر فوجی سپاہی کب تک اپنی رضا مندی سے ایک نہایت غیر مقبول حکومت کے تحفظ کے لئے اپنے ہم وطنوں کو گولیوں کا نشانہ بناتے رہیں گے؟ شاہ نے اپنی فوج پر تکیہ کر رکھا ہے لیکن جو ملا (علماء) کہہ رہے ہیں وہ ایک عام ذہنی سطح کے فوجی کی سوچ سے زیادہ دور کی بات نہیں ہے۔ اس طرح فوج پر کلی انحصار کر کے شاہ ایک غیر یقینی جوا کھیل رہے ہیں۔

"نیوز ویک" کے ایران کے فوجیوں کے بارے میں تبصرہ کے ضمن میں ایک واقعہ بے محل نہ ہوگا کہ ایک فوجی سپاہی نے عوام پر گولی چلانے کا حکم ماننے سے انکار کرتے ہوئے اپنے کمانڈر پر گولی چلا دی اور پھر خود کو بھی گولی مار کر خودکشی کر لی۔ اس واقعہ سے ایرانی فوج میں ایک نئے رجحان ابھر آنے کی نشان دہی ہوتی ہے جو زود یا بدیر شہنشاہ کے حق میں مضر ثابت ہو سکتا ہے۔

بقیہ: عبدالمجیب خان

بھوکے ہیں۔ گذشتہ ۳۱ سال سے اقتدار میں آنے کی کوشش کر رہے تھے اور جنہیں قومی انتخابات میں بھی سخت ترین مقابلے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

راؤ فرمان علی نے اس بات کو تسلیم بھی کیا ہے کہ پاکستانی ایک سیاستدان کی طرح "شیر دا پتر" ہے وہ انہیں ایک مضبوط قوت اور فیصلہ کن حد تک پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ جنرل ضیا کو پہلے یہ مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ ملک کے دو بڑے لیڈروں سے' جناب بھٹو کو نظر انداز کر کے قومی حکومت کے سلسلے میں رابطہ پیدا کریں۔ لہٰذا وہ پہلے ایئر مارشل اصغر خان کے پاس گئے اور انہیں قومی حکومت کی صدارت کی پیشکش کی لیکن اصغر خان نے اس پیشکش کو رد کرتے ہوئے فوری انتخابات کا مطالبہ کیا اور حزب اختلاف کا کردار ادا کرنے کے سلسلے میں اپنے موقف کو دہرایا' اس کے بعد جنرل ضیا ولی خان کے پاس گئے جو کہ این ڈی پی کے ممتاز رہنماؤں میں شمار کئے جاتے ہیں اور جنوری ۱۹۷۸ء میں تین سال زیر حراست رہنے کے بعد دوبارہ ملکی سیاست میں نمودار ہوتے ہیں۔ ولی خان نے بھی اس پیشکش کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ فوجی حکومت کے ساتھ اشتراک کرنے سے ان کی سیاسی پوزیشن متاثر ہو سکتی ہے۔ انہوں نے بھی فوری انتخابات کرانے کی ضرورت پر زور دیا۔

جنرل ضیا نے اپنے اس مقصد میں ناکام ہونے کے بعد فیصلہ کیا کہ اب وہ کابینہ خود ہی تشکیل دیں گے۔ ایک ماہ قبل جب پی این اے کے لیڈروں کو اس بات کا علم ہو گیا کہ یہ کابینہ نا اہل مسلم لیگیوں پر مشتمل ہوگی تو پی این اے کی بقیہ چھ جماعتوں کی قیادت کرتے ہوئے جماعت اسلامی نے بھی حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ جس کے نتیجے میں پی این اے میں زبردست انتشار ہو گیا اور این ڈی پی نے حکومت میں شمولیت سے انکار کرتے ہوئے پی این اے سے علیحدگی اختیار کر لی۔

اب بظاہر جنرل ضیا کا جھکاؤ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی کو مستقبل میں پاکستان کی شہری جماعتوں کی حیثیت سے فروغ دینے کی جانب نظر آتا ہے اور وہ یقیناً اپنی سیاست کے لئے انہی جماعتوں کا سہارا لینا بھی چاہتے ہیں۔ مسلم لیگ کا نام اب صرف قیام پاکستان کے ناطے سے زندہ ہے جب کہ جماعت اسلامی پاکستان میں قانونی اور شہری انتظامیہ میں انتہائی سخت قسم کا اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتی ہے۔ جنرل راؤ فرمان علی کا دعویٰ ہے کہ ان دو جماعتوں سے عوام میں بے پناہ مقبولیت کے باعث ایک قابل بھروسہ سول کابینہ تشکیل دی جا سکتی ہے اور جنرل ضیا کو بھی اپنی کوششوں میں قابل احترام حد تک حمایت حاصل ہو جائے گی۔

یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اب دوسری جماعتیں اور زیادہ مشکوک ہو کر حالات کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اور یہ کہا جا رہا ہے کہ مسلم لیگ اور جماعت اسلامی اپنی رہی سہی ساکھ سے بھی محروم ہو گئی ہیں۔ کیونکہ لوگ اب انہیں اقتدار کے بھوکے اور لالچی کہنے لگے ہیں۔

دسمبر میں لوکل گورنمنٹ کے انتخابات کا منصوبہ بھی جنرل ضیا کے ایک دوسرے سیاسی پینترے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جنرل ضیا نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ سیاسی خلا کو نچلی سطح سے پُر کیا جائے اور امید ظاہر کی ہے کہ لوکل گورنمنٹ کے انتخابات سے اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے یہ منصوبہ "بنیادی جمہوریتوں" کے منصوبے سے مشابہت رکھتا ہے۔ جسے ایوب خان نے متعارف کرایا تھا۔ جنہوں نے پاکستان پر پوری ساٹھ کی دہائی تک حکمرانی کی تھی۔ یہ مشابہت غیر مشتبہ حد تک درست ہے یا نہیں لیکن اس پر عوام کا رد عمل قطعی مختلف اور منفی ہے۔

فوجی جنتا کا ایک سال مکمل ہو چکا ہے لیکن پیپلز پارٹی اور جناب بھٹو نے جنرل ضیاء الحق کے تمام تر اقدامات اور الزام تراشیوں کے باوجود ایک سیاسی قوت کی موت مرنے سے انکار ہی کیا۔ حکومت پیپلز پارٹی کو دھڑے بندیوں میں تقسیم کرنے اور مولانا کوثر نیازی کی قیادت میں ایک نیا گروپ تشکیل دینے میں مکمل طور پر ناکام ثابت ہوئی۔ پاکستانی رائے دہندگان کی ایک بڑی اکثریت آج بھی جناب بھٹو کی پرستار ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جنرلوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی ان کا سایہ سیاسی افق پر ہمیشہ غالب رہے گا۔ ان کی سزائے موت پر عملدرآمد ہوتا ہے یا وہ زندہ رہیں۔ اور یہی وہ ناقابل حل مسئلہ ہے جس میں جنرل ضیاء الحق پھنسے ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ کتنے خلوص کے ساتھ جمہوری انتخابات کی منصوبہ بندی کر سکتے ہیں جب کہ رائے دہندگان کے آزادی کے ساتھ اپنا حق استعمال کرنے کی صورت میں ایک ہی شخص دوبارہ اقتدار میں آ جائے گا۔ اور جسے وہ کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لہٰذا اس سے واضح ہوتا ہے کہ جنرل ضیا آنے والے چند برسوں تک برسر اقتدار رہیں گے؟؟

بقیہ: بیگم نارو

قبول کرنے کو تیار نہیں۔ حتیٰ کہ قومی اتحاد والے بھی اسے دیکھ کر ناک پر رومال رکھ لیتے ہیں۔ اس لئے اس کے پاس جیسے دوسرے موقع پرست سرمایہ داروں کے علیحدہ ہونے سے پارٹی مضبوط ہوئی ہے۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

آخر میں انہوں نے کہا کہ وہ بہت جلد سندھ کا دورہ کریں گی۔ تاکہ صوبہ میں خواتین کی تنظیم کو منظم کیا جا سکے اور انہیں آئندہ انتخابات کے لئے تیار کیا جا سکے۔ بیگم نارو نے کارکنوں سے کہا وہ بددل نہ ہوں ایسے موقع پر سیاسی جماعتوں پر آتے رہتے ہیں۔ ظلم کی طاقتیں ہمارا امتحان لے رہی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہم اس امتحان میں سرخرو ہو کر نکلیں گے۔ آخری فتح ہماری ہوگی اس لئے کہ ہم حق پر ہیں۔ فتح حق پرستوں کا مقدر ہے۔

پی۔ایف۔یو۔جے اور اپنک کے ۸ نکات

- پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس سمیت تمام سیاہ قوانین ختم کیے جائیں، اخبارات اور اخباری کارکنوں کے خلاف غیر معمولی قوانین کے تحت کارروائی نہ کی جائے اگر ان کے خلاف کارروائی مقصود ہو تو عام قوانین کے تحت عام عدالتوں میں کی جائے
- ہفت روزہ الفتح کراچی، ہفت روزہ معیار کراچی، دیگر اخبارات اور جرائد کی جبری بندش ختم کی جائے، اخبارات اور جرائد کو پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس کے تحت ضمانت طلبی کے جو نوٹس دیئے گئے ہیں وہ واپس لیے جائیں۔
- تمام گرفتار شدہ اخباری کارکنوں، مزدوروں، ہاریوں اور طلباء کو رہا کیا جائے، اور انہیں دی گئی سزا ختم کی جائے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کے اخبارات کے برطرف کیے جانے والے تمام اخباری کارکنوں کو ملازمتوں پر بحال کیا جائے

- دس فیصد مصارف زندگی الاؤنس جون ۱۹۷۴ سے بمعہ بقایا جات ادا کیا جائے
- بڑھتی ہوئی مہنگائی کے پیش نظر پچاس فیصد اضافی تنخواہ الاؤنس دیا جائے
- کرایہ مکان کی شرح پندرہ فیصد سے بڑھا کر بنیادی تنخواہ کے ۵۰ فیصد کی شرح سے دیا جائے۔

- روزافزوں مہنگائی کے پیش نظر ہر سال مہنگائی کی شرح سے تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے۔ اس کے تعین کا کام ویج بورڈ پر عملدرآمد کے ٹریبونل کو تفویض کیا جائے
- ویج بورڈ پر عملدرآمد کے ٹریبونل کی کارکردگی کو مزید بہتر اور موثر بنایا جائے اور اس میں مزید دو ججوں کا اضافہ کیا جائے تاکہ تیزی سے مقدمات کا فیصلہ ہو سکے۔

مَیں نے استعفیٰ کیوں دیا

سابق صدر اندرونی کہانیاں خود بیان کرتے ہیں